مجروحؔ

فیضؔ

ادیبؔ

16

اپنی مٹّی سونا ہے

مصنّف

ارشد نظرؔ

وجدؔ

انجمؔ فوقی

احمد نسیمؔ

عزیز ادیبؔ

مقیم اثرؔ

اپنی مٹّی سونا ہے

(تنقید)

جملہ حقوق بنام شبانہ نظر

کتاب کا نام : ''اپنی مٹّی سونا ہے''
مصنف : ارشد نظر
کمپیوٹر کمپوزنگ : عقیل ورلڈ ڈی ٹی پی سینٹر۔فون:233388(02554)
طباعت : اقصیٰ آفسیٹ پرنٹرس، ملّا باڑہ،
مالیگاؤں۔فون:230945(02554)
سن طباعت : اگست ۲۰۰۶ء
تعداد : ۵۰۰
ناشر : شعیب عالم
تقسیم کار : مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، پرنس بلڈنگ، ممبئی
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی
سویرا بک ڈپو، محمد علی روڈ، مالیگاؤں
اطفال بک ڈپو، محمد علی روڈ، مالیگاؤں
سٹی بک ڈپو، ۱۴۷، قصاب باڑہ مسجد، محمد علی روڈ، مالیگاؤں
مصنف کا پتہ : سروے نمبر ۱۶۴، پلاٹ نمبر ۳۲، گلی نمبر ۳،
عباس نگر، مالیگاؤں ۴۲۳۲۰۳ ضلع ناسک، مہاراشٹر
9860657313
9371416409

38989

Rs 100

والدہ

محترمہ

کے

نام

رَبَّنَا اغفِرلِی

وَلِوَالِدَیَّ

وَ لِلمُومِنِیْنَ

یَومَ

یَقُومُ الحِسَاب

خار وطن از سُنبُل و ریحاں خوش تر
خاک وطن از تخت سلیماں خوش تر
یوسف کہ درمصر پادشاہی می کرد
می گفت گدا بودنِ کنعاں خوش تر

شیخ سعدیؒ

(وطن کا کانٹا سنبل و ریحاں سے بھتر ھے۔
وطن کی مٹی تخت سلیماں سے بھتر ھے۔
یوسف علیہ السلام کہ مصر میں بادشاھت کرتے تھے کھا کرتے تھے
کنعاں کا فقیر ھونا (اس بادشاھت سے) بھتر ھے۔)

اپنا تو ایمان یہی ہے ہو لے جو کچھ ہونا ہے
غیر کے ہیرے کنکر پتھر اپنی مٹّی سونا ہے

ادیبؔ مالیگانوی

فہرست مضامین

۱ گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے ۸

۲ مالیگاؤں کے ادبی ماحول کا موجودہ شعری اظہار ۱۴

۳ ادب میں تنقیدی رویوں کی چند مثالیں ۳۹

۴ اے عصائے موسوی درعصر ما! امام احمد رضا ۴۹

۵ ادیبؔ مالیگانوی اور روایت ۵۹

۶ جمالیاتی اقدار کا شاعر! سکندر علی وجدؔ ۷۲

۷ غزل کی نئی جہتوں کا شاعر! فیض احمد فیضؔ ۸۲

۸ اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم۔ مجروح سلطانپوری ۸۹

۹ شعور ذات کا شاعر! انجم فوقی بدایونی ۹۸

۱۰ نئے ادب میں احمد نسیم مینانگری کا فکری چہرہ ۱۰۵

۱۱ ''خاک رنگ'' کا شاعر! احمد نسیم مینانگری ۱۱۸

۱۲ مقیم اثرؔ بیاولی شخص و شاعر ۱۲۹

۱۳ سہل ممتنع کا شاعر! عزیزؔ ادیبی ۱۵۴

ہر زہ مشتاب وپئے جادہ شناساں بردار
اے کہ در راہِ سخن، چوں تو ہزار آمدورفت

غالبؔ

جلوۂ حسن تو آورد مرا برسرِ فکر
تو حنا بستی ومن معنئ رنگیں بستم

بیدلؔ

اپنی مٹّی سونا ھے

(تنقید)

مصنّف

ارشد نظر

گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے
فیض احمد فیضؔ

نہ تو میں کوئی ممتاز ادیب ہوں نہ ناقد نہ کوئی عظیم شاعر اور نہ ہی میں کسی علمی خوش فہمی میں مبتلا ہوں اور یہ کہہ کر نہ ہی خواہمخواہ اپنی عزت بڑھا رہا ہوں ------ پھر بھی میں نے تنقیدی مضامین کی کتاب ''اپنی مٹّی سونا ہے'' لکھ ڈالی۔ بہتیروں کے نزدیک ہوسکتا ہے یہ کتاب تنقیدی تصورات کا اچھا نمونہ نہ ثابت ہو یا تفصیلی تنقیدی مطالعے کا نمونہ نہ ہو ------ مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ------ اگر آج کی اردو تنقید وسعت اختیار کر چکی ہے تو پھر کلیم الدین کا یہ جملہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے ------ چہ جائیکہ ''ہماری اردو تنقید حالؔی سے آگے نہیں جاسکی ---'' کسی کو یہ کتاب حوالوں سے بھری نظر آتی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ----- کیونکہ حوالے کے بغیر انسان کا اپنا وجود بھی ادھورا ہے ----- ڈاکٹر مسیح الزماں کے خیال کو میں اپنے الفاظ میں یوں رقم کرتا ہوں کہ '' کتاب کے قابلِ غور پہلو پر بھی نظر رکھنی چاہیئے --- رنگا رنگ جلوے اور متنوع تنقیدی نمونوں سے جو بطور حوالہ پڑھنے کو ملتے ہیں تو اس سے قاری کو سہولت مل جاتی ہے ---'' خامیاں اور غلطیاں کس کے یہاں نہیں ہوتیں --- اسی حوالے سے میں نے اپنے آپ کو پیش کیا ہے --- میں نے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ وسیلہ اظہار اور لسانی اظہار میں شعوری اور لاشعوری تصادم کے مطالعے کی حاصل شدہ بصیرت موجود ہے تو میرے نزدیک اس میں کوئی عیب کی بات نہیں ---- بعض لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو مطالعے کی حاصل شدہ بصیرت کو بہ زعم خویش یوں پیش کرتے ہیں گویا صرف وہی

اس عصر کے (تنقیدی) امام ہیں۔ حالانکہ ان کا "غیر" کبھی "میں" سے متفق نہیں رہتا ۔۔۔۔۔۔۔

خیر آمدم برسرِ مطلب ! کتاب "اپنی مٹّی سونا ہے" حاضرِ خدمت ہے۔۔۔۔۔ اگر اس کتاب کے مضمون میں کوئی تنقیدی گوشہ تشنہ نظر آتا ہے یا محسوس ہوتا ہے تو پڑھنے والا خود اس تشنگی کو محسوس کر کے مضمون مکمل کر لے گا۔۔۔ کاش اس میں یہ بات (گوشہ) بھی آجاتی ۔۔۔ یہ جملہ کہہ کر مضمون کی تشنگی دور کر لے گا اس طرح ہر مضمون کا کوئی نہ کوئی گوشہ اسے مکمل مضمون کی صورت میں نظر آئے گا۔۔۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہر کوئی میرے تنقیدی موقف سے پورے طور پر اتفاق کر ہی لے۔

لفظ اختلاف بھی بڑا عجیب لفظ ہے۔ اس سے کون محفوظ رہ سکتا ہے جو میں محفوظ رہوں گا۔ کیونکہ اختلاف رنگ و بو تو انسان کی سرشت میں ہے ہو سکتا ہے جو اختلاف میں نے کیا ہے کل وہ بھی مجھ سے اختلاف کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ادب میں یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔۔۔۔۔ تنقید و اختلاف کا حق ہر کسی کو حاصل ہے ۔۔۔۔۔ اور میں یہ حق چھیننا بھی نہیں چاہتا اس لئے کہ پھر تنقید و تبصرے کا مرحلہ کیسے طے ہوگا؟ اس طرح یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔۔۔۔۔ اور ادب میں حرف آخر کوئی چیز نہیں ہوتی نہ ہی ادب میں کوئی آخری نقاد ہوتا ہے۔

نمی باشد مخالف قول و فعل راستاں باہم
کہ گفتارِ قلم باشد ز رفتارِ قلم پیدا
غنی کشمیری

(راست گویوں کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہوتا ھے
کہ قلم کی بات قلم کی رفتار ھی سے پیدا ہوتی ھے۔)

مالیگاؤں کے ادبی تخلیقی پس منظر کو مجموعی طور پر برصغیر میں کسی نے سراہا نہیں۔ جہاں تک زبانی جمع خرچ کا تعلق ہے بڑے بڑے جغادری نقاد و شعراء نے مالیگاؤں کو اردو کا ادبی مرکز قرار دیا لیکن یہاں کے فنکاروں کو ادبی نقد و نظر کے آئینے میں کسی نے پرکھنے کی کوشش نہیں کی۔ ادبی مرکز قرار دینے کے باوجود جب شعری اظہار کی بابت ترجیح دینے کی بات آتی ہے تو گویا ان نقادوں کو سانپ سونگھ جاتا ہے۔

ان شعراء کی تخلیقات کو کافی حد تک نظر انداز کیا جاتا ہے۔ آج نہیں تو کل انہیں ماننا ہی پڑے گا ۔۔۔۔ ان شعراء کا مستقبل خواہ کچھ بھی ہو انہیں آسانی سے مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے ابھرنے کے تخلیقی امکانات موجود ہیں ۔۔۔۔۔ ادیبؔ مالیگانوی ہوں یا نئی نسل کے شعراء ۔۔۔۔ ادبی کور چشمی کی یہ مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ادبی نقد و نظر کے پیمانے میں ان کا کیا ''رتبہ خاص'' ہے کسی نے توجہ نہیں دی ۔۔۔۔۔ اس پر برصغیر کے نقادوں کو سوچنا چاہیئے ۔۔۔۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں ان کی جی حضوری سے بچنا بھی چاہیئے ۔۔۔۔۔ ایک تو ہمارے یہاں تجارتی پیمانے پر پبلیکیشن ہاوس یا اشاعتی ادارہ نہیں ہے۔ جبکہ اردو والوں کی بڑی تعداد یہاں سکونت پذیر ہے۔ اس شہر کو اس سمت بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔۔۔۔ آج اردو نصاب میں آٹھویں سے بی۔ اے تک مالیگاؤں کے شعراء کی غزلیں شامل کی جا سکتی ہیں۔ اکا دکا شعراء کو جگہ ضرور ملی ہے اس طرف پونہ نصابی بورڈ کے ارکان کو توجہ دینی چاہیئے۔ ادیب مالیگانوی، نشاط شاہدوی، سہیل مالیگانوی، عتیق احمد عتیق، احمد نسیم مینا نگری اور مقیم اثر بیادلی کے کلام نصابِ تعلیم میں شامل ہونے کے قابل ہیں۔ اس میں بس ہمیں بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔

مالیگاؤں کا ادبی ماحول بہت عرصے تک نقاد سے خالی رہا۔۔۔ اسے بدقسمتی کہیں یا خوش بختی ۔۔۔ ہمارے یہاں ایک نقاد ہیں لیکن انہوں نے مقامی فنکاروں کی تخلیقات کو ادبی نقد و نظر کے آئینے میں رکھ کر پرکھا ہی نہیں ۔۔۔۔ یعنی وہی رونا کہ وہ یہاں کے فنکاروں کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے ہیں ۔۔۔ یا یوں کہیے ''گھر کی مرغی دال برابر'' ۔۔۔۔ دال برابر ہوتی بھی تو دل کو تسلی ہو جاتی ۔۔۔۔ لیکن انہیں اتنی فرصت بھی نہیں کہ یہاں کے فنکاروں کے ادبی شہ پاروں کے کچھ گوشوں کو برصغیر میں پیش کر کے سامنے لاتے ۔۔۔۔ لیکن سوائے افسوس کے کچھ حاصل نہیں ۔۔۔ یہ سچ ہے بقول احمد نسیم مینا نگری ''فن بوئے گل کی طرح ہے جو پھیلنے پر مجبور ہے۔'' لیکن اس اشتہاری دور میں ادب بھی میڈیا کا شکار ہوا ہے بہر کیف یہاں کے فنکار بڑی بے نیازی سے اپنے شعری سفر پر گامزن ہیں۔

ویسے بھی ایک نقاد کو معتبر، متوازن، شگفتہ مزاج معتدل شخصیت کا حامل ہونا چاہیئے۔ نقاد کا کام مرض کی نشاندہی کرنا ہے۔ نقاد کے اندر فہم و فراست بھی ہونی چاہیئے جذبات اور جوش کی بجائے فہم و تدبر

سے بھی کام لینا چاہیئے ورنہ سبھی کو یہ ہنر سہل انگاری ہنر لگنے لگی۔ سہل پسندی کے ساتھ انگشت نمائی بڑی آسانی کے ساتھ کی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے بعض ادبی نکتہ سنجی معرض التواء میں پڑ جاتی ہے۔۔۔۔ ایسی صورتِ حال میں برملا اس سقم کا اظہار کرنا چاہیئے۔ نئی نسل کے فنکاروں کو بھی تنقید کے میدان میں آنا چاہیئے تا کہ صالح فکر کے عناصر یہاں کی ادبی فضا میں پنپ سکیں۔۔۔ اس ادبی پس منظر میں فنکاروں کو خود سے پہل کرنی چاہیئے ضروری نہیں کہ کسی کی سرپرستی میں قدم اٹھایا جائے بلکہ اپنے وجود و مزاج کو خود کفیل بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ تا کہ یہاں کے ادبی شہ پاروں کو برصغیر میں پیش کیا جا سکے۔

نقادوں کا رویہ اپنے تئیں سمجھداری اور احتیاط کا ہونا چاہیئے۔ ہمارے نقاد ادبی شہ پاروں کی روشنی میں شعراء کی تخلیقات کو پرکھنا نہیں جانتے۔ بہت سے نئے شعراء کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ نقادوں کی ادبی انتہا پسندی کی وجہ سے میں نے اظہارِ خیال کیا تا کہ مکمل غیر جانبداری سے اظہار خیال ہو۔۔۔۔ وہ بھی بلا کسی جھجھک کے۔۔۔۔ نقاد کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کس حد تک انصاف سے کام لیتا ہے ایک مثالی نقاد کو آزادانہ طور پر ادبی فن پارے کو پرکھنا چاہیئے۔ نقاد اپنے فرض منصبی سے غافل نہ ہو۔ ادبی ذمہ داریوں کی تکمیل میں پوری دیانت داری کے ساتھ کام کرنا چاہیئے۔ موجودہ نقادوں کو اپنے اندر تبدیلی یا بدلاؤ لانا ضروری ہے۔۔۔۔ ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔۔۔۔ والی پالیسی کو رد کرنا ہوگا۔۔۔۔ بتانا یہ مقصود ہے کہ ہم اپنی ادبی کمزوریوں کا جائزہ لیں۔ ہمارے ناقدین یہ سب بھول بیٹھے ہیں موجودہ دور کے نقادوں نے اپنے آپ کو کچھ مخصوص فنکاروں کے ساتھ ''لفظی و ادبی تشریح'' تک محدود رکھا ہے جو کہ اچھی علامت نہیں ہے۔ ہمارے ناقدین ادبی پسماندگی کا رونا روتے ہیں۔ ادبی پسماندگی کا رونا رو کر صرف اپنا غلبہ اور دبدبہ ادب میں قائم رکھنا چاہتے ہیں بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ادبی پسماندگی خود ہمارے نقادوں کی اپنی اپج ہے جو ان کے ذہنوں کو دیمک کر طرح چاٹ رہی ہے۔ ناقدین کو عبدالحمید عدمؔ کے اس شعر کے مطابق عمل پیرا ہونا چاہیئے۔

دونوں باذوق آدمی ہیں عدمؔ
میں ہوا یا مرا رقیب ہوا

اس طرح بہت سے نئے شعراء یہ ذلت و رسوائی اپنے عہد کے نقادوں کے ہاتھوں برداشت کر رہے ہیں۔ اگر نقاد نئے شعراء کے بارے میں اشتباہ رکھیں گے تو ادب کا یہی حال ہوگا۔ اور نقادوں کو جھوٹی تسکین اور نمود و نمائش کی گرفت سے نکل کر تنقیدی رویوں کی روشن مثال قائم کرنی چاہیئے۔ ان کے غیاب میں چند مخصوص فنکاروں کی سرگوشیاں ہوتی ہیں۔ اسی لئے میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ ہمارے نئے شعراء کی کاوشیں ہمارے عہد کے بعض نقادوں سے بہتر ہیں۔

زندگی کی دائمی و ابدی قدریں رنج و الم، دکھ درد، خوشی اور غم، انسان سے وابستہ ہیں۔ سماج کا کوئی فرد اس سے بچ نہیں سکتا۔ یہ تو فن کار پر منحصر ہے اس کا سامنا وہ کس طرح کرتا ہے۔ ہر فنکار اپنے سماج و معاشرے کی ترجمانی اپنے اپنے انداز سے کرتا ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔ کوئی بھی فنکار، اپنے عصر، معاشرے اور حالات سے کٹا ہوا نہیں ہوتا بلکہ سماج اور معاشرے کی ترجمانی اپنے فن کے ذریعے کرتا ہے۔ ویسے بھی غزل کا شعر اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔ اس کی مثال میں اپنے اشعار سے دینا چاہوں گا۔ اپنے اشعار کا حوالہ دے کر میں اپنا قصیدہ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ حقیقت حال کا اظہار کر رہا ہوں کہ کوئی بھی فن کار اپنے عصر اور معاشرے سے کٹا ہوا نہیں ہوتا۔ ۱۹۸۹ء میں وشوناتھ پرتاب سنگھ کی مرکزی حکومت زوال میں آئی تو میں نے یہ شعر کہا تھا۔

پھول بھی دشمن اس کے پروں کے
تتلی کسی بحران میں آئی

یکساں سول کوڈ کو بنیاد بنا کر جب مسلم پرسنل لاء پر شاہ بانو کیس کی وجہ سے حملہ ہوا تو شاعر اس کا اظہار اس طرح کرتا ہے۔

ٹوٹ کر اور بھی ابھری ہے تجلی ان کی
شورشِ سنگ سے شیشوں کے مقدر جاگے

۱۹۷۵ء ایمرجنسی کے خلاف میں نے اس طرح اظہار کیا تھا۔

دلوں پہ درد کا ہر چند آج پہرا ہے
ہمارے عہد کا منظر بھی کیا سنہرا ہے

ملک میں فرقہ وارانہ فسادات اور اربابِ اقتدار کی سیاسی چیرہ دستیوں کو میں نے اس طرح بے نقاب کیا ہے۔

ہمارے عہد کے صیاد ہم سے چاہیں گے
کہ قتل گاہ کو اپنا چمن کہا جائے

گھر تو جل کر راکھ ہوا ہے
آگ دلوں میں روشن ہے

محتسب! قتل گہوں میں ابھی تازہ ہے لہو
کیسے میں شہر ستم گر کا قصیدہ لکھوں

ہمارے ٹوٹنے کا اس کو بھی کچھ غم نہیں ہوتا
یہ وہ پتھر ہے جو فریاد سے بھی نم نہیں ہوتا

آتشِ نمرود، تاریخی واقعہ کی طرف ایک اشارہ ہے وہیں یہ اشارہ آج کے عصر کے پس منظر میں استعمال ہوسکتا ہے۔ ''آتشِ نمرود'' ''بش حکومت'' کی طرف اشارہ ہے جس کا اظہار میں نے یوں کیا ہے۔

اپنے اندر آج بھی جب حوصلہ پاتے ہیں لوگ
آتشِ نمرود کو گلزار کر جاتے ہیں لوگ

میں نے ہمیشہ اس بات کا اظہار کیا ہے کہ شاعری آسان نہیں ضروری نہیں کہ شاعر ہمہ وقت شعر ہی کہتا رہے۔ معیاری شاعری کے لئے مطالعہ ضروری ہے۔۔۔۔ خراب شعر کی تخلیق سے بہتر ہے کہ شعر نہ کہیں بلکہ معیاری شاعری کا مطالعہ کریں۔۔۔۔۔ مطالعہ فن کو جلا بخشتا ہے۔۔۔۔۔ اور باقی سب کچھ شاعر کے باطنی جوہر پر منحصر ہے یعنی وہی فطری صلاحیت یا استعداد پر۔۔۔۔۔

مرتبہ جگنو کا ذاتی روشنی سے ہے بلند
شمع محفل خود نہیں ہوتی منوّر رات کو

ارشد نظر

مالیگاؤں کے ادبی ماحول کا

موجودہ شعری اظہار

مالیگاؤں کسی زمانے میں، صرف ادیب الملک حضرت ادیب مالیگانوی کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ سر زمینِ مالیگاؤں کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے گوشے گوشے میں ادبی خدمات کے ذریعے شہرت و ناموری کے علم کو بلند کیا، تنقید کے میدان میں سلیم شہزاد، شاعری کے میدان میں ادیب مالیگانوی، نشاط شاہدوی، سہیل مالیگانوی، عتیق احمد عتیق، احمد نسیم مینا نگری، سید عارف اور شبیر آصف ہیں افسانہ نگاری میں ہندو پاک کے معتبر افسانہ نگار سلطان سبحانی اور احمد عثمانی صاحب ہیں بقول قمر اقبال۔۔۔۔۔۔ ''آج شہر مالیگاؤں کو ایک مشینی شہر کی حیثیت سے جو شہرت حاصل ہے اتنی ہی شہرت، ادبی لحاظ سے بھی حاصل ہے۔ یہاں سے ''جواز'' ''توازن'' اور ''ہم زباں'' جیسے جریدے نے جو شہرت حاصل کی ہے اس کا انکار ممکن نہیں ہے۔'' گوان رسالوں میں مقامی فن کاروں کی تخلیقات زیادہ شائع نہ ہوسکیں۔ جس سے وہ فائدہ اٹھا سکیں۔ گویا نثر ہو یا شاعری کا میدان ہو مالیگاؤں کو اعلیٰ مقام و مرتبہ ادبی اعتبار سے حاصل رہا ہے۔

مالیگاؤں ادبی حیثیت سے جتنا پیچیدہ ہے اسے سمجھنا بھی اتنا ہی دشوار ہے یہ شہر طوطا چشم بھی ہے کیسے پہلو تہی کرتا ہے، حقائق سے کس طرح چشم پوشی کرتا ہے اس شہر کی سلوٹوں میں کئی نگیں جڑے ہیں ان نگینوں کو سمجھنے کے لئے اعلیٰ ادراک کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔۔ یہ شہر شکوہ کج کلاہی کا انداز چشم بصیرت میں، خوش گماں، آنکھوں کے راز کو پڑھتا بھی ہے اور سمجھتا بھی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ شہر یاراں پا بہ گِل، دست بستہ، سوادِ حرف کا آشنا، توفیق عرض ہنر کا سخن شناس۔۔۔۔۔۔ سگانِ راہ و طفلانِ شہر کے روزنِ قفس کے ایک ایک تار سے آشنا ہے۔۔۔۔۔۔ دودِ یک سینہ سوزاں میں حریفانہ کشمکش شعلۂ جوالہ کی طرح ہمیشہ خنجر بکف رہا ہے۔۔۔۔۔۔ دریچۂ نیم باز آنکھوں سے لہو کی حرمت اور حرفِ انکار کے حلقۂ خواب کو پرکھنا بھی جانتا ہے۔۔۔۔۔۔ برہنہ شاخوں اور ہوا مزاجوں کے خوگر فتنہ فن کاروں کو

اپنے عالم تقریر میں ڈھالنے کا ہنر بھی جانتا ہے ہر فن کار اس شہر ناپُرساں اور حلقۂ دشمنان میں زہر بھرے دانتوں سے اپنے آپ کو ڈسواتا ہے جب اسے زندگی گذارنے اور شاعری کرنے کا ہنر آتا ہے۔۔۔۔۔

ایسے حالات میں رفو گرانِ شہر کو سرِ مژگاں بین السطور پڑھنا ہے لیکن اپنے رنگ و آہنگ سے۔۔۔۔

مالیگاؤں شہر علمی، دینی درس گاہوں کا شہر ہے یہاں پاور لوم کی زندگی کے ساتھ ساتھ ذہنی و روحانی تسکین کیلئے مختلف نشستوں اور مشاعروں کا اہتمام ہوتا رہتا ہے چند اشعار جو مشہور ہوئے انہیں آپ بھی پڑھیئے۔

یاد میری سنبھال کر رکھنا
نشاط غیرت دل کا یہی تقاضہ ہے

میرا کیا میں رہا رہا نہ رہا
وہ جام توڑ دے جو تشنگی بجھا نہ سکے

نشاطؔ شاہدوی

سکندر لُوٹ کر بھی خوش نہیں دولت زمانے کی
لٹا کر مایۂ ہستی قلندر رقص کرتا ہے

ادیبؔ مالیگانوی

واقعہ تھا جو میں نے عرض کیا
اس میں غصے کی کوئی بات نہیں

وقارؔ حیدری

سوز غم لاکھ بڑھے دل نہیں گھبرانے کا
اسم کا ذات پہ کہتے ہیں اثر ہوتا ہے
مجھ کو رو لینے دو جی بھر کے مری غفلت پر

آگ سے کھیلنا معمول ہے پروانے کا
غم کدہ نام نہ رکھ حسن کے کاشانے کا
آج ایک عمر کے بعد آپ کی یاد آئی ہے

نظرؔ بابا

بندگی بے چارگی ہے کیا ہنر پیدا کروں
اس پہ مت جا خانۂ درویش گر ہے بے چراغ

در ہزاروں ہیں یہاں پر کتنے سر پیدا کروں
وہ اگر آئیں تو میں شمس و قمر پیدا کروں

سہیلؔ مالیگانوی

ہم سے انجانے میں اک جام بھی ٹوٹے تو خطا
آپ دل توڑ کے جائیں تو کوئی بات نہیں

اطہر الخیری

لوٹ آئے تری بزم کو آئینہ دکھا کر
کچھ لوگ یہ سمجھے کہ بُرا مان گئے ہم

عتیق احمد عتیق

سورج نے لکھا ہے ترے رخسار پہ مضموں
زلفوں پہ ستاروں نے مقالات لکھے ہیں
دانش کے سوا کون ہے اے جانِ تمنا
جس نے ترے دہکے ہوئے حالات لکھے ہیں

دانش مالیگانوی

اپنے مرکز پہ سمٹ آیا تھا دل غم بن کر
تیر پھر اس کا نشانے سے اچٹتا کیسے

عبدالمجید سرور

کتنے تاریک گناہوں کو چھپا لیتی ہے
جگمگاتی ہوئی پوشاک تمہیں کیا معلوم
غیرت کا تقاضہ ہے بڑھ کر اسے ٹھکرادے
جب کوئی حقارت سے سونے کا نوالہ دے

عزیز ادیبی

اکیلا سچ کی طرح جب سے میں نکلنے لگا
تمام شہر کو میرا وجود کھلنے لگا

احمد نسیم مینانگری

گرے گا ایک بھی پتہ تو چیخ ابھرے گی
یہ ڈال ڈال کا رشتہ بہت پرانا ہے

سید عارفؔ

پھر یوں ہوا کسی نے بٹھایا نہ پاس میں
پیوند لگ چکے تھے ہمارے لباس میں

رزاق عادلؔ

مجھ سے دیکھا نہ گیا جھیل کے پانی کا سکوت
میری فطرت ہے کہ بیٹھا ہوا کنکر پھینکوں

رامشؔ مالیگانوی

بس بھی کر قاتل کہ ان نیزوں پہ سر دیکھے گا کون
سب اگر کٹ جائیں گے تیرا ہنر دیکھے گا کون

اشفاق انجمؔ

سلگتی ریت پہ تلوے لہو لہو کرنا
پھر اس کے بعد گلابوں کی آرزو کرنا

عبدالسلامؔ اظہر

نہ جانے کون دعاؤں میں یاد رکھتا ہے
میں ڈوبتا ہوں تو دریا اچھالتا ہے مجھے

یہ برگ و بار یونہی نہیں لہلہائے ہیں
پیڑوں نے موسموں کے بڑے دکھ اُٹھائے ہیں

شبیر آصفؔ

باطل کا قول ، زور بیاں تک درست ہے
اور حرف حق یہاں سے وہاں تک درست ہے

اسحٰق خضرؔ

خاموش مزاجی تمہیں جینے نہیں دے گی
''اس دور میں جینا ہے تو کہرام مچا دو''

ہارون اکسیرؔ

بڑی مشکل سے ملتی ہے یہ نعمت نیک نامی کی
ذرا سا ڈگمگا جاؤ تو عزت چھین لیتا ہے

اثرؔ صدیقی

اونچے محلوں کے کنگوروں پہ برسنے والے
میرے کھیتوں کی طرف آ، ترا جاتا کیا ہے
بات کہنے کا سلیقہ سب کے حصے میں کہاں
کچھ الگ انداز ہے اس شخص کی تقریر کا

ارشد نظرؔ

ان شعراء سے اختلاف رنگ و بو رکھتے ہوئے بھی میں نے تحسین نظر سے کام لیا ہے تا کہ آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقف رہیں کہا جاتا ہے کہ'' یکسانیت فطرت کے بھی خلاف ہے اور فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے۔'' اس لئے ہر شاعر اپنے رنگ و آہنگ میں جُدا ہے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

یا اسی مفہوم میں غالبؔ کا شعر ہے

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے

آج سے ۱۸، ۲۰ برس پہلے میں نے لکھا تھا۔۔۔۔شاعری کسی بھی عہد کی ہو اس کے اثرات دُور رس ہوتے ہیں آج کا عصر زندگی کے جس گہرے خلفشار سے دوچار ہے اس کا اثر فطری طور پر جاری ادب پر مُرتّب ہوگا چند دہائیوں کے وسیع تنقیدی رجحانات جو عالمی ادب سے آئے ہیں۔ اردو ادب و شاعری میں بھی تیزی سے سرایت ہوئے ہیں۔ جدید ادب کی پہلی دہائی کا خام مواد ہر چند چونکا دینے والا مواد تھا۔ مگر دوسری دہائی میں یہ مواد یکسانیت کی رو میں ڈوب کر کہیں کہیں سطحیت کا شکار بھی ہوا، جب سمندر میں بھونچال آتا ہے تو تہہ کی گرد کے ساتھ ساتھ قیمتی خزانوں کو بھی اوپر لے آتا ہے یہی حال نئی شاعری کے بھونچال کا ہوا، جہاں کچھ سطحیت کی فضا اُبھری ہے وہیں فکر وفن کے نئے تجربات کے قیمتی رنگ بھی نمایاں ہوئے ہیں۔

ذات کا کرب، عرفان کی گہری پیاس نے فن کار کو تشکیک و تیقن کی کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے فکری کشمکش کا یہ اضطراب ہمارے عصری ادب کی ایک پہچان بن کر سامنے آیا ہے ہمارے عہد کی شاعری میں نئی لفظیات کی نئی پیاس ہے۔ ہمارے عہد کی نا آسودگی کی گہری کیفیات یکساں مضامین کی گونج سے تھکی تھکی آگے بڑھتی رہیں اسمیں شک نہیں کہ ان گہری کیفیات کے اظہار میں شاعری میں کہیں کہیں برجستگی و ندرتِ بیان کا اظہار ہوا ہے۔

شاعری میں ندرتِ بیان سے کس کو انکار ہوسکتا ہے صرف ندرتِ بیان کے چکّر میں پڑ کر شعری اظہار میں زبان کے ساتھ کھلواڑ کرنا کہاں تک درست ہے غالب نے تخلیقی عمل کا اظہار کتنے خوبصورت انداز میں کیا ہے

اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقت آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمون عالی ہے

آیئے آج کل مالیگاؤں میں ادبی رفتار و معیار کا کیا حال ہے مندرجہ ذیل اشعار سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا اسمیں نئے اور پرانے شعراء کو بھی میں نے شامل کرلیا ہے کیوں کہ ہمارے یہاں کے بہت سارے شعراء آج بھی ادبی عصبیت کا شکار ہیں مثال کے طور پر برصغیر میں نئی شاعری پر جتنے مضامین لکھے گئے ان میں مالیگاؤں کے شعراء سید عارف، سلیم شہزاد، مقیم اثر بیاولی، شبیر آصف، ارشد نظر اور دیگر

شعراء کے اشعار کو نظر انداز کیا گیا ہے اس اندازِ تغافل اور تجاہل عارفانہ کو میں کیا نام دوں۔۔۔کیا یہ گروہ بندی کا نتیجہ ہے یا پھر ادبی فرقہ پرستی یا علاقائی عصبیت کا شکار ہے۔۔۔۔۔یا ان شعراء نے ادب میں کوئی قابلِ اعتبار پیش رفت نہیں کی ہے۔۔۔۔یا پھر ان سب شعراء کے اشعار قابلِ اعتنا نہیں ہیں ۔۔۔۔یا ان اشعار میں کوئی چمک دمک نہیں ہے۔۔۔۔۔۔۔غیر جانبداری سے آپ بھی ان اشعار کو پڑھئے۔۔۔۔۔میں جھوٹا ہوں۔۔۔۔۔یا سچا۔۔۔۔۔آپ خود اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

جن کے اندر صدیاں سانسیں لیتی ہیں
مرے اندر جو شب بردار تھے، وہ زرد موسم
تری ہتھیلی سے کہکشاں تک
جہاں سے چُپ سادھ لی تھی میں نے

ان لمحوں کے پنکھ کترنے والا میں
کئی دن سے، بہ رنگ کہکشاں پھیلے ہوئے ہیں
مرے لہو کی حنا ہے روشن
وہیں سے کوہ ندا ہے روشن

عتیق احمد عتیق

کافی ہے اک فقیر کو سایہ درخت کا
ادھر زمین ہمارے لہو کی پیاسی ہے
لکھی نہ گئی مجھ سے تعریف یزیدوں کی
تیز چیخیں جنہیں ہلا نہ سکیں

اہل ہوس کے واسطے کم ہے جہان بھی
اُدھر کا حکم ہے سرحد کو پار مت کرنا
میں نام شہیدوں میں اپنا بھی لکھا آیا
میری چپ نے انہیں جھنجھوڑ دیا

حامی بلڈانوی

جس کو چُنتی ہے مشیّت کسی مقصد کیلئے
کسی کی جھیل سی آنکھوں کو جب بھی دیکھا ہے
جو تھک گئے تو ستاروں میں جا کے سونے کا
عشق جوگی سانپ کی آنکھوں میں بھی آسن جمائے
ہوا و ابر کو چھو لے جو تیرا حسن و جمال

اس کا انداز ہی ہم سب سے جدا ہوتا ہے
بدن سراب سے دریا ضرور پھوٹا ہے
ہمارا عصر ہے دریا میں بیج بونے کا
جس کو منتر یاد ہے وہ سانپ کے آگے چلے
تو لفظ لفظ میں بدر منیر رہتا ہے

مقیم اثر بیاولی

اس واسطے ہماری طرف انگلیاں اُٹھیں
پھر موجِ بوئے گل مرے سر سے گذر گئی
وجود کھو دیا اس بیج نے مگر عادلؔ

جینے کا اپنا ڈھنگ تھا، اپنے اصول تھے
پھر پھوٹنے لگا لہو دیوار سنگ سے
گلوں کے بوجھ سے ہیں ڈالیاں لدی کیسی

رزاق عادلؔ

کسی رُت میں جب مسکراتا ہے تو
مجھے بھی ابر کرم سے ملا تھا اک قطرہ
بال و پر ہوں تو فضا کافی ہے
ہم گماں گشت پرندوں کے لئے
اس خدائی سے نہیں کوئی غرض
ہے روایت کہ نبی ہو کے جو نکلا گھر سے
کھلا کہ اپنے ہی دیدار کی تمنا تھی
ہمارے شہر کو حی علی الفلاح کا غم

نمو، پتھروں میں جگاتا ہے تو
مجھے بھی دینا پڑا تھا حساب دریا کا
ورنہ پرواز انا کافی ہے
آسماں بھی ہو تو نا کافی ہے
ہم کو بس نام خدا کافی ہے
ٹوٹ کے رہ گیا اس شخص کا رشتہ گھر سے
جو بار بار سرِ دار لے گئی مجھ کو
ہمارے شہر میں شورِ اذان اونچا ہے

سلیم شہزاد

شیشوں کے ٹوٹ جانے کا ماتم بہت ہوا
آنگن میں بال کھولے اداسی کھڑی رہی
جب چاند نیا مانگے، جب خواب نیا مانگے
تمام لوگ ہی اب ہم سے دور رہتے ہیں
کیا کیا اپنے دل پر گذری کچھ نہ کہو تو بہتر ہے
کن پانیوں کے اُور مجھے پیاس لے چلی
نیکی ہمارے نام کی دریا میں ڈالنا
تنہا کبھی تو چھوڑ بھٹکنے کے واسطے

اپنی صدا کو شیشہ بنانا ہی چاہیئے
موسم ترے وصال کے کیا گھات کر گئے
ہنستے ہوئے بچے کو بہتر ہے رُلا دینا
سنا ہے گاؤں میں اب بھی ہماری عزت ہے
ہنستے ہنستے عارفؔ اس کی بات سنو تو بہتر ہے
نیلے سمندروں میں اُترنے کے بعد بھی
روشن چراغ دیکھ کے حملہ کرے گی رات
ممکن ہے اس بہانے ترے پاس آ سکوں

سید عارف

سو جان بھی بچا کے میں شہرت نہ پا سکا
بہت ممکن ہے خود ہی چیخ اُٹھے گا
کچھ نہیں تو میرے رہنے پر یہاں
میں اُس سے دور بہت دور جا رہا تھا مگر

اِک قتل کر کے کتنا وہ مشہور ہو گیا
یہ خنجر درد کے دل میں اُتر کر
سنگ باری کا ہنر زندہ تو ہے
ہر ایک موڑ پہ ملتی رہی گلی اُس کی

سلطان سبحانی

لاتمثیلی حسن کی کیا توصیف لکھوں
سب ناموں میں پیارا ہے اک نام ترا
اُسی کے نام کی خوشبو مرے نفوس میں ہے
مشعل بدست کوئی نہیں میرے شہر میں

لفظوں کے مہتاب ادھورے لگتے ہیں
باقی سب القاب ادھورے لگتے ہیں
ہے میری روح کا تازہ سفر اسی کی طرف
ہر سمت روشنی کا سمندر اچھال دے

اظہار سلیم

خموشی نگہِ رمز آشنا سے اُدھر
ہوا کے تیر سے زخمی ہے بوئے گل صالح
لرزاں بادل کا سایا تھا
اس قدر مجھ پر سنگباری کی

عجیب شور تھا اک سازِ بے صدا سے اُدھر
تھا کس کا ہاتھ مگر شوخیِ ہوا سے اُدھر
یا سورج ہی ہانپ رہا تھا
کر گیا مجھ کو آئینہ کوئی

صالح ابن تابش

دھواں نہیں ، نہ سہی ، روشنی نہیں نہ سہی
ترے خلاف نہیں مجھ میں تابِ گویائی
کھو گئی ہے اس مہذب شہر میں
اپنی ہر خواہش سفر کو گرد کرتا میں چلوں

یہ اپنی آگ میں جلتا ہوا سا کچھ تو ہے
مرے قلم سے یہ ڈھلتا ہوا سا کچھ تو ہے
تیرے میرے درمیاں کی رشتگی
سبز امکانی ہوس کو زرد کرتا میں چلوں

اپنے دامن میں سمیٹوں اشک روتی حسرتیں
کہاں کہاں میں سمیٹوں ضرورتیں اپنی
تو خدا اور میں انا بیتاب

ہر خوشی کو واقفِ ہر درد کرتا میں چلوں
خریدنے کو تو ساری دکان باقی ہے
بیچ اپنے عطا دعا بیتاب

سلطان شاہد

لب اظہار لو دینے لگا ہے
حبس کیسا ہے عرصۂ جاں میں
لب کشائی کی ضرورت کیا ہے
میں حصارِ طلسم حرف میں ہوں
سُنا رہی ہیں ہوائیں حکایتیں اپنی
پیالہ حدت مے سے چٹخ بھی جاتا ہے
کسی نے حال بھی پوچھا تو دل دھڑکتا ہے
ترک جفا میں تری انا کا سوال ہے
تیری نہیں تو میری انا کا سوال ہے

سخن کرتا دھواں ہے اور میں ہوں
جل گئے پیڑ فصل باراں میں
زخم بھی اپنی زباں رکھتے ہیں
اے ہوا چھو کے اب بتا مجھ کو
ہمیں بھی یاد ہے لیکن روایتیں اپنی
سنبھل نہ پائیں گی مجھ سے محبتیں اپنی
تم اپنے پاس ہی رکھو عنایتیں اپنی
اپنی روایتوں کا مجھے بھی خیال ہے
اپنے تعصّبات کا مٹنا محال ہے

شبیر آصف

شہ بطحا کا دشمن ایک ہے بوجہل سے بُش تک
دل عاشق میں جلاتا ہے محبت کے چراغ
کشتیاں پھونک دیں جو ساحل پر
جان لینے کا حق نہیں ورنہ
فیصلے سچ کے حق میں ہوتے ہیں

یہ بوڑھا سانپ ہر موسم میں پیراہن بدلتا ہے
شوخ جذبات کو زنجیر عطا کرتا ہے
ہم اسی خاندان والے ہیں
تیر تو میری بھی کمان میں تھا
میں ابھی تک اسی گمان میں تھا

اشفاق انجم

اندر کی آگ سب کو کہاں راس آتی ہے
نہ آہٹوں کا تسلسل نہ کچھ صدا مجھ میں
یہ رسم اب بھی ہے زندہ مرے قبیلے میں
اک قطرہ اوس کے لئے پھرتے ہیں شہر شہر
خدایا ریشمی لمحوں کے بیچ رکھنا اسے

کچھ لوگ کیمیا نہ ہوئے خاک ہو گئے
عجب سکوت کا صحرا اتر گیا مجھ میں
خود اپنے بہتے ہوئے خون سے وضو کرنا
ہائے وہ لوگ جن پہ سمندر سبو ہوئے
جلاتا ہے جو سرِ شام اک دیا مجھ میں

عبدالسلام اظہر

شکوہ ستم کیسا ہونٹ سی لئے میں نے
جانے کیسے عالم میں سامنے تم آئے تھے

کون دیکھ سکتا ہے آپ کی پشیمانی
آج تک نہیں جاتی آئینے کی حیرانی

ریاض احمد ریاضؔ

آگ سے کھیلتا رہا برسوں
بہت مانوس ہیں اس سے پرندے
پاؤں بوڑھے پیڑ کے زیرِ زمیں بڑھتے رہے
بے حسی اس قدر جوانوں پر
کوئی آگ ایسی بھڑکے کہ قبائے برف اترے
اجنبی سب مجھے سمجھتے ہیں
دل کے بیچ صدیوں کے فاصلے رہے قائم
میرے دن بھٹک رہے ہیں کسی شب کی جستجو میں

برف سے انگلیاں جلا بیٹھا
میرے آنگن میں جو بوڑھا شجر ہے
تا کہ پتوں پر نمودِ زندگی باقی رہے
اف یہ کائی نئے مکانوں پر
کوئی آفتاب پگھلے میرے منجمد لہو میں
میں بھی عادی ہوں گھر بدلنے کا
یوں تو دو مکانوں کو جوڑتی ہیں دیواریں
میری رات کھو گئی ہے کہیں شہر آرزو میں

ہارون فرازؔ

لرزہ بر اندام ہر جھوٹا سپیرا ہو گیا
کس کے آجانے سے ہر شے ہو گئی دو آتشہ

کس کی پرچھائیں پڑی کہ سانپ بینا ہو گیا
قطرہ دریا، دریا شعلہ، شعلہ پیاسا ہو گیا

کھُلا جب ہم پہ لمحہ گفتگو کا
اک کرن اندر سے باہر کو سفر کرتی ہوئی
اوپر اوپر کاٹتا رہتا ہے طوفانِ نفی
سخن کے دریا کو پایاب کون دیکھے گا

صدف میں قید تھا موسم نمو کا
آسماں در آسماں صرفِ نظر کرتی ہوئی
اندر اندر موج دریا کو بھنور کرتی ہوئی
جو ہم بھی جاگ گئے خواب کون دیکھے گا

صابر زاہد

میرا بچہ جہاں دیدہ بہت ہے
میں اپنا رنگ کب کا کھو چکا ہوں
دو عصا پھر بھی ہے معجزہ بے اثر
سر کہ واقف نہ تھا دستک کے ہنر سے قیصر
میں چوراہے پہ تھک کر سو گیا ہوں
میراث میں تصویر بھی اک چھوڑی ہے ایسی
بس اک حقیر سے جگنو نے زعم توڑ دیا
حصار تجربہ سے ہم نکلنے ہی نہیں پاتے
ہر پرند پر اس کی اتباع واجب ہے

مجھے خوش دیکھ کے روتا بہت ہے
ضرورت نے مجھے پہنا بہت ہے
پاؤں میں رقص کرتا بھنور اور میں
سامنا ہو گیا دیوار کا در سے پہلے
مجھے شہرت کہاں آ کر ملی ہے
وارث میرے حیران ہیں ٹکڑے نہیں ہوتے
خدائی کرنے چلی تھی ہوا اندھیرے میں
ہر اک لمحہ کوئی تازہ ضرورت اوڑھ لیتے ہیں
جس نے سب اڑانوں کے زوایے بدل ڈالے

سلیم قیصر

اپنا کے تیرے درد کو یوں شاد ہو گئے
اہل خرد نے قتل ہمیں کر دیا تو کیا
صبح ہوئی تو آنکھ سے میری
اک ترا درد سلامت ہے تو زندہ ہوں میں
کچھ آرزو کے پھول نگاہوں میں جب کھلے

یادوں کی بستیوں میں ہم آباد ہو گئے
اہل جنوں کے نام سے ہم یاد ہو گئے
آنسو بن کر وہ نکلا تھا
ورنہ جینے کے لئے دنیا میں کیا رکھا ہے
پلکوں میں کوئی یاس کے موتی پرو گیا

احمد شناور

جب میری جبیں پہ تھی لکھی خانہ بدوشی
مصرعہ مصرعہ درد کا حامل
ڈوبنے والا اور ابھرنے والا میں
پتھرو ہم بھی پتھر کبھی تھے مگر
قتل گاہوں کے مناظر تو بہت دیکھ چکے

پھر میں نے بنایا تھا جو گھر کس کے لئے تھا
نغمہ نغمہ سوز نہاں ہے
کرن کرن ہر سمت بکھرنے والا میں
آئینوں میں رہے آئینہ ہو گئے
زندگی کی کوئی تصویر دکھا دی جائے

ہارون اکسیر

ہم نے کرنوں کو سمجھ رکھا تھا سورج ورنہ
کچھ بات ہے کہ اہل نظر بولتے نہیں
"آتا کہاں ہے تیر پلٹ کر کمان میں"
عکس اپنا دکھائی دیتا ہے
وہ کبھی تو ادھر سے گذرے گا
ختم ہوتا نہیں سفر میرا
دن بھر سوچا یاد نہ آیا
جاگتی آنکھوں میں سپنا تھا
زندگی تیری آبرو ہم سے
ہنس کے بولا وہ خوبرو ہم سے
وہ بھی تنقید ہم پہ کرتے ہیں

کتنے سورج بھی تو کرنوں کے طلبگار ملے
ہم پتھروں کو لعل و گہر بولتے نہیں
ہم اپنی بات باردگر بولتے نہیں
کون آیا ہے آئینہ بن کے
منتظر ہوں میں راستہ بن کے
رکھ دیا ہے میری اُڑان میں کیا
خواب میں کس کا چہرہ دیکھا
رات تھی اور سورج نکلا تھا
"لوگ ملتے ہیں با وضو ہم سے"
کون ملتا ہے ہو بہو ہم سے
جن کا دامن ہوا ، رفو ہم سے

ارشد نظر

زندگی پردۂ سراب میں ہے
یہ کہانی مگر نصاب میں ہے

کون روپوش ہو گیا مجھ میں
کیا سکوں دل کو اضطراب میں ہے

جب حقیقت سے روشناس ہوا
اپنے اندر میں بے لباس ہوا

کچھ تو انجام ہو کرداروں کا
اب کہانی میں نیا موڑ آئے

استعارہ ہے کن اجالوں کا
خواب روشن ہے بجھتی آنکھوں کا

نیند کو کیا ہوا، خواب کو کیا ہوا
رات تھک سی گئی جاگتا دیکھ کر

حکیم خان حکیم

چاند حیا سے جب سمٹا تھا
آگ کا دریا جاگ اُٹھا تھا

سارے وعدے جھوٹے اس کے
''خالی کمرہ بول رہا تھا''

تیری باتیں حرف آخر
دنیا بولے جھوٹی بات

کتنی پیچیدہ ہو گئیں گلیاں
چلتے رہتے ہیں گھر نہیں آتا

ملنا بھی تیرا خواب کی صورت لگا مجھے
ہر شخص جیسے ایک ضرورت لگا مجھے

اے زندگی تجھے تو میں کب کا بھلا چکا
وہ کون تھا جو تیری ہی صورت لگا مجھے

کال پڑا ہے باہر باہر
ساون برسے میرے اندر

چاند نکلا تو سلسلے نکلے
دھوپ اُتری تو سو گیا بستر

میں نے پوچھا تھا حال موسم کا
اُس کی آنکھیں بتا گئیں کیا کیا

متین شہزاد

اب ریت کر رہی ہے سمندر پہ تبصرہ
اپنی تمام پیاس کو یکجا کئے ہوئے

وہ سبز چھاؤں مرے اپنے ہی مکان میں ہے
یہ دشت دشت کی آوارگی کے بعد کھلا

تذبذب میں ہے گم آئینہ داری
میں اپنے عکس سے آگے کھڑا ہوں

مشتاق احمد مشتاق

کتب خانہ

میں اپنے زخموں سے سورج کا کام لیتا ہوں
جلانا پڑتا ہے آنکھوں کو نیند کی لو سے

ہے کوئی ایسی رات کہ جس کی سحر نہیں
مری آنکھوں کی یہ جھلیں ذرا برفاب ہونے دو
کردار میں خوبی کوئی پیدا نہیں کرتے
آتش گل میں پڑ گئی ٹھنڈک
لحاظِ ہمسفری آپ رکھ نہیں سکتے

جب ہمارے قتل کی تیاریاں ہونے لگیں
اپنی دنیا ہی مرکز سے جب ہٹ گئی
وہ رگ و پے میں ایسا بس جائے
وہ نظر سے کلام کرتے ہیں
ساری سوچوں کا بس یہی حاصل

دست مصور لمحہ لمحہ کوئی حسیں تصویر بنے
بوڑھی چھت اب بوجھ بنی ہے دیواریں خاموش کھڑی ہیں
موجوں میں زندگی کی حرارت کے واسطے
شفق کے رنگ رُخسارِ صبا سے بات کرتے ہیں
ندامت کے چراغوں سے چمک جاتی ہیں تقدیریں

گھنیری شب کا یہاں جب پڑاو ہوتا ہے
قیام تب کہیں آنکھوں میں خواب کرتا ہے
سلیم انمول

لیکن عذاب در بدری سے مفر نہیں
تماشہ یہ بھی دیکھو گے دھواں پانی سے نکلے گا
بنتے ہیں شجر اور کہیں سایا نہیں کرتے
ہر کرن ماہ تاب ہو جسے
بھنور اچھال بھی دے کشتیاں تو کیا ہو گا
ریاض صہبا

اک ہجوم دوستاں بھی کوچہ قاتل میں تھا
کیا زمیں دیکھنا آسماں دیکھنا
لفظ اس کے ہوں اور بولوں میں
بات کی بات اور سناٹا
اک تری ذات اور سناٹا
امین صدیقی

برف پہاڑوں کی پگھلے دریاؤں کی تقدیر بنے
اینٹ اور پتھر پوچھ رہے ہیں کس کی کس سے یاری ہے
دریا نے میری آنکھ سے اک قطرہ لے لیا
یہاں کے پھول پازیب ہوا سے بات کرتے ہیں
اندھیری رات کے آنسو خدا سے بات کرتے ہیں
اثر صدیقی

چمکتا تھا بدن جگنو کا لیکن
اندھیری رات کا ممنون تھا وہ

مسئلے ختم ہوتے نہیں رات تک
لے کر آتا ہے سورج نیا مسئلہ

ٹوٹ جاتے ہیں جہاں سارے سہارے مولا
اس جگہ ہوتی ہے محسوس ضرورت تیری

بدل گیا ہے اب انصاف کا عالم افسؔر
بری ہیں مجرم و قاتل، سزا ہے کاغذ پر

امان افسؔر ایولوی

بھٹکنے پر نئی دنیا ملے گی
ہماری لغزشِ پا معتبر ہے

موج در موج بس گئی یہ صدا
میں سمندر ہوں میں سمندر ہوں

سفینہ جو ساحل پہ ڈوبا تو پھر
سمندر ، ہوا ، بادباں کچھ نہیں

اگر دل میں ہو کفر ہی موجزن
تو لب پر سرودِ اذاں کچھ نہیں

الحق خضؔر

ان کا خول جو اترا بدن سے
نکل آیا میں صدیوں کے گہن سے

درون دل جو رہی آگہی تو سب خوش تھے
جو لب کھلے تو یہاں کوئی مہربان نہیں

سیاسیات سے پرے حقیقتیں ہیں بے نقاب
نہ بھوک اپنی مٹ سکی نہ اپنے نام گھر ہوا

مسافتوں کا تعین نہ سنگ میل سے کر
سفر ہے شرط تیری خود کو تو اڑان میں رکھ

میں اپنی لاش کو کاندھے پہ رکھے دور تلک
پکارتے ہوئے قاتل کا نام آیا ہوں

متین آزؔر

احساس کی صلیب پہ رکھ کر مرا وجود
اندر سے کر رہا ہے مجھے لخت لخت کون

میرے بارے میں تیری رائے بہت اچھی ہے
صرف انداز غلط ہے ترے سمجھانے کا

ہونے دیجے ہوتی رہیں گی تنقیدوں کی یلغاریں
میں ہی کیا ہوں پھل آنے پر پیڑ بھی پتھر کھاتے ہیں

میں گذرا ہوں اک ایسی راہ سے بھی
جہاں اُگتے نہیں سائے شجر سے

عادل فاروقی

تم اپنے خواب کا کوئی ستارہ ٹانک دو ان میں
مرے خدا نے عطا کی ہے وہ نظر مجھ کو
بلندیوں میں بھی اس کو قرار مل نہ سکا
مجھے یقین میں لے یا مرے یقین میں آ

اندھیرے ہوں جو آنکھوں میں مسافر لوٹ جاتے ہیں
جو عکس دیکھ سکے آئینوں سے آگے بھی
اسی لئے تو ملا آبشار مٹی سے
یہی نباہ کا سب سے حسین پہلو ہے

لئیق ہاشمی

نشیمن پھونک دو یا سارا گلشن ہی جلا ڈالو
پرندے سر چھپانے کا ٹھکانے ڈھونڈ لیتے ہیں

الیاس صدیقی

چمکتے چاند سے چہروں میں ڈھونڈ تا کیا ہے
شکستہ دل کے کسی آئینے میں دیکھ مجھے

رفعت صدیقی

دیکھا کسی درخت کا سایہ تو رو دیئے
جب تیرے انتظار کے دن یاد آگئے

دانش نندوربادی

تسکین روح خانہ بدوشی تک آگئی
ہم جیسے بے گھروں کو لگے سائباں سراب

انیس اظہر

قسمت میں دھوپ ہے تو وہی اب ہے چاندنی
سورج کے ڈر سے کیا کوئی دیوار دیکھنا

رفیق احمد رفیق

اہل چمن یہ سازش صیاد تو نہیں
ہے جو خزاں بھی بہاروں کے درمیاں

نظیر جوہر

راحتیں بے چین تھیں کل مجھ سے ملنے کیلئے
مشکلوں نے آج آسانی سے پہچانا مجھے

ہمایوں فانوس

خامشی درد مسلسل پہ سسکتی ہے بہت
موسم گل ہے کہ مرہم نہیں ہونے پاتا

جاوید آفاق

ہوا میں سسکیاں میں سن رہا ہوں
کسی پہ آج بھاری رات ہوگی

اقبال نذیر

مرا عروج کوئی وجہ افتخار نہ تھا
فراز مل گیا اپنی نفی میں دیکھ مجھے

ابواحمد نشاط

ذرا سے دل میں عبث پیچ و تاب کون رکھے
ہزار غم ہیں غموں کا حساب کون رکھے

جمال ناصر

اس کی قدرت ہے بنادے ذرّہ ذرّہ آفتاب
اپنی مرضی سے کوئی شمس و قمر ہوتا نہیں

لطف ہاروتی

سب اس کے خواب تھے آنکھوں میں ریت کی مانند
ہتھیلیوں پہ جو سورج سجائے پھرتا تھا

ریاض احسن

اندھیروں کی قبادست ہنر سے چاک کرتا ہوں
کسی سے مانگ کر سورج سویرا میں نہیں کرتا

رفیق سرور

لاکھ دکھلاؤ مجھے خونیں مناظر لیکن
اب مرے خواب بھی ہجرت نہیں کرنے والے

تقی حیدر

زندگی نور کو ترستی ہے آ گیا چاند آشیانوں میں
جسم کی روشنی کا بجھنا تھا تیرگی آ گئی مکانوں میں

نخشب مسعود

لوگ اس طرح مجھ سے غافل ہیں
جیسے اس دور کا خدا ہوں میں

عبدالباری طالب

ان سے بچھڑتے وقت کا منظر نہ پوچھئے
روتا ہے کیسے ایک سمندر نہ پوچھئے

افضل عارفی

میرا حال جو ہے اچھا ہے اپنی کہو تم کیسے ہو
کتنے دن کے بعد ملے ہو کس دنیا میں رہتے ہو

مجھ سے ہوائیں پوچھ رہی ہیں سانجھ سویرے ساحل پر
ایک اک کنکر پھینک رہے ہو کس کی یاد میں رہتے ہو

ثانی مالیگانوی

نکل رہا ہے دھواں آنکھ کے دریچوں سے
مکانِ ذات میں جلتا ہوا سا کچھ تو ہے

الطاف ضیاء

حادثوں کی زد میں رہ کر مضمحل ہوتے نہیں
مسکرانا جن کی عادت ہے کبھی روتے نہیں

ندیم ادیبی

اپنے اندر کی آواز سنتا
اتنی فرصت کہاں آدمی کو

عبدالحق تنویر

کس میں جرأت ہے کون بولے گا
ہاں یہ قاتل ہے وہ ستم گر ہے

مجید کوثر

تنکے نہ ہمیں سمجھو اے تیز ہواؤں تم
ہم لوگ جزیرے ہیں طوفاں سے اُبھرتے ہیں

طاہر پٹنی

اندھے بھی احساس کی آنکھیں رکھتے ہیں
بتلا دینگے دن نکلا یا رات ہوئی

ڈاکٹر نعیم اختر

حسنِ اعمال سے خالی ہوا کاسہ میرا
صاحبِ کُن سے تو میں فیضِ عصا لایا تھا

ابوالعرفان اسدؔ

تتلی کے پرکاٹ کے صاحب اُڑنے کا فرمان ملے
اپنے گھر کی دیواروں پر آؤ ہم تحریر کریں

کرب اسیری ہی بہتر ہے ایسی خودمختاری سے
جیتی بازی ہم نے ہاری اپنوں کی غداری سے

نجمی ابن جاوید

تنگ آکر اے زندگی تجھ سے
مرنا چاہوں تو مر نہیں سکتا

انیس نیرؔ

واقعہ ہو کہ روایت کی نزاکت حسرتؔ
شعر ہوتا ہے وہی دل کو جو چھو کر نکلے

یعقوب حسرت

مدتوں سے ہے لاپتہ ڈھونڈو
اب تو ہر آدمی فرشتہ ہے
کہیں آتش فشاں میں بن نہ جاؤں

مجھ میں زندہ ضمیر تھا ڈھونڈو
ابنِ آدم کہاں گیا ڈھونڈو
دھواں اُٹھنے لگا پرچھائیوں سے

ندا فاروقی

بہرحال طوالت کے خوف سے دیگر شعراء کے اشعار شامل نہ کر سکا دیگر شعراء کی کاوشیں بھی لائق صد تحسین ہیں ان میں بہت سے شعراء نے مناظر فطرت کے تقاضے سے اپنے آپ کو تلاش کیا ہے نئے پیکروں سے نئی شاعری کا تانا بانا بُنا ہے اوپر دیئے گئے اشعار میں احساس کے رنگوں کی فضا ایک رچی ہوئی کیفیت کے ساتھ ہے۔ (ان میں بہت سے شعراء کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں اور مستقبل قریب میں دیگر شعراء کے مجموعے آنے والے ہیں۔) اظہار و بیان میں سادگی و صفائی لہجے اور لے میں ایک لوچ اور بانکپن کا انداز، آہنگ میں ایک نغمگی اور ترنم بھی ہے۔ (ان میں سے کئی ایک شعراء اپنا مقام بنا

چکے ہیں۔) نئی شاعری کی معتدل فضا میں لہجہ روشن بھی ہے اور دل نشیں بھی لیکن اسمیں بہت سارے شعراء انفرادیت پیدا کرنے کیلئے اجتہادی منزلوں سے دھیرے دھیرے گذر رہے ہیں ان کے لئے فیض کی زبان میں اتنا ہی کہنا کافی ہے۔

بس وہی سرخ رو ہوا جس نے
بحر خوں میں شناوری کی ہے

نئے لفظ و معنی کے ساتھ نئی شاعری کا سفر جاری ہے گو ان شعراء کو روایتی شاعری سے نفرت نہیں ہے بلکہ روایت کی توسیع اور رجحان ان کا مقصد ہے۔ نئی شاعری کے معصومانہ تجزیہ سے ایک فطری لگاؤ ہے میرا خیال ہے انسانی فطرت جتنی محسوسات کے دائرے میں جو تجربات کرتی ہیں وہی شعری پیکروں میں سرایت ہوں تو شاعری زندگی کی طرح دلنشیں ہوتی ہے۔ فنی احساس کا ادراک اس سفر کی جان ہے اور ہر فنکار اس سفر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہر فنکار کی پہچان اس کی اپنی فکر اور احساس کی سچائی سے ہوتی ہے ۔۔۔۔۔ نئے شعراء کے یہاں نئے ادبی رجحانات کا گہرا عکس ہے۔ ان شعراء کے تمام گوشے میں سمیٹ نہیں پایا لیکن ان کی شاعری کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد ضرور ملتی ہے۔

آج کل یہ کہا جا رہا ہے کہ اچھی شاعری کا فقدان ہے اور شاعری میں قابل اعتبار پیش رفت نہیں ہو رہی ہے۔ احمد صغیر صدیقی اس بات سے نالاں ہیں کہ اچھی شاعری نہیں ہو رہی ہے۔ شاعری کے زوال کے اسباب کیا ہیں۔ ''موزوں طبعی'' کا رونا رو رہے ہیں یا پھر تمام تک بند موزوں طبع ہوتے ہیں۔ ہر سال مجموعے آسانی سے چھپ جاتے ہیں اور آج کل یہی ہو رہا ہے۔ نئے شاعروں کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں ہے اور نہ ہی شعراء ندرت بیان میں کمال رکھتے ہیں۔ قدرت زبان کے ساتھ ''ارادے'' کی شاعری ہو رہی ہے۔ آگے مزید لکھتے ہیں ''کوا کائیں کائیں کر کے لاکھ سمجھاتا ہے کہ وہ کوئی سریلا راگ الاپ رہا ہے اس کا کوئی علاقہ کوئل کی مدھر کوک سے نہیں ہوتا۔۔۔۔۔'' یہ کہہ کر تمام نئے شعراء کو رد تو نہیں کیا جا سکتا ہے۔ میں مالیگاؤں کے شعراء کے حوالے سے ان سب باتوں کی نفی کرتا ہوں اوپر دیئے گئے اشعار سے میں بتانا چاہتا ہوں کہ ان سب شعراء کا علاقہ کوئل کی مدھر کوک سے ہے نہ کہ کوّے کی

کائیں کائیں سے۔۔۔۔۔ان اشعار میں ہر فنکار نے اپنے فطری مذاق کے ساتھ ہمہ گیر جذبات میں ڈوب کر اشعار کہے ہیں۔صرف کہنے کیلئے شعر نہیں کہے ہیں یا پھر افتادِ طبع کا اقتضاء (تقاضہ) نہیں ہے بلکہ غلامانہ فکر (تقلید) سے آزاد یعنی روایت سے ہٹ کر شعر کہے ہیں اپنے طور پر سوچتے اور محسوس کرتے ہیں ان اشعار میں ندرت بیانی اور جوش خود بخود ڈھل گئے ہیں۔احمد صغیر صدیقی لکھتے ہیں: شاعری محنت طلب ہنر ہے۔استعارات کی ہفت رنگی سے عبارت ہے۔ہوسکتا ہے جو اشعار میں نے حوالے میں پیش کئے ہیں ان میں بہتیروں کے یہاں غیر معمولی پیش رفت کا اندازہ نہ ہو لیکن ہر شاعر نے اپنے رنگ اور اپنے ڈھنگ سے پیش رفت کی۔بہر حال ان کے اختراعی جوہر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے احمد صغیر صدیقی ہر سال شعری مجموعہ شائع ہونے کی شکایت کرتے ہیں لیکن ان مجموعوں میں وہ جوہر تلاش نہیں کرتے دوسری اہم بات یہ کہ جو شعراء خاصے established یا مقبول ہیں بس انہیں شعراء کو غور و فکر سے پڑھتے ہیں ان کی نظریں بس انہیں مقبول و معروف شعراء پر جمی ہوئی ہیں۔جب ذہن میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہیکہ نئے شعراء میں نیا پن نہیں ہے یا کوئی قابل اعتبار پیش رفت نہیں ہو رہی ہے تو اس کا مطلب میں یہی نکالوں گا کہ مقبول و معروف شعراء کی عمر مزید ۱۰۔۱۵ برس بڑھا رہے ہیں ادب میں یہ سیاست بھی بڑی عجیب ہے بہت سارے نئے شعراء کے مجموعے بازار میں آچکے ہیں کیا ان مجموعوں میں وہ جوہر تلاش کئے گئے جس کا رونا غالباً ہر نقاد روتا ہے بلکہ بعض مدیر حضرات تبصرے کیلئے دو کاپیاں منگواتے ہیں لیکن سالہا سال ہو جاتے ہیں ان کتابوں پر تبصرے نہیں ہوتے ہیں کیونکہ یہ غیر معروف فنکار ہیں۔۔ ہاں فنکار اپنی کتاب کے ساتھ تبصرہ بھیج دیں تو شاید چھپ جائے صرف ان ہی کتابوں پر تبصرے شائع ہوتے ہیں جن کے ادبی تعلقات مدیر حضرات سے ہوں۔یہی حال اخبارات کا بھی ہے چاہے انقلاب ہو، اردو ٹائمز ہو یا منصف ہو۔۔۔۔۔ادب میں گروپ بندی اور فرقہ پرستی کی ہوا نے نئے شعراء کو موقع نہیں دیا ہے۔نئی شاعری کے ضمن میں مَیں نے جو اشعار دیئے ہیں آج تک نئی شاعری کے ضمن میں یہ اشعار برصغیر کے شعراء کے ساتھ نئی شاعری کے حوالے سے تنقیدی مضامین میں نہیں آئے ہیں۔کہنے کا مطلب یہ ہیکہ اچھی شاعری ہو رہی ہے پھر اگر صاف گوئی سے کام لوں تو یہی مطلب

نکلتا ہے ہمارے نقاد علاقائی عصبیت کے شکار ہیں، علاقائی عصبیت سے اٹھ کر فن پارے پہ نظر ڈالیں عصبیت کی عینک ہٹا کر ان اشعار کا مطالعہ کریں۔۔۔تو ان میں بہت سے اشعار آپ کو مل جائیں گے جو آپ کے مضمون کی زینت بن سکیں گے۔ان خوبصورت اشعار کے حوالوں سے آپ کے مضمون میں چار چاند لگ جائیں گے اور آپ کے مضمون کی اہمیت بڑھ جائے گی۔

آج کا انسانی ذہن حق و باطل، صحیح اور غلط، اچھے اور بُرے کے درمیان جو فرق ہے اس کو وہ کھلے طور پر تسلیم کرتا ہے لیکن ہمارے نقادوں کا بُرا ہو وہ ادب کے مہاجن بنے بیٹھے ہیں ادبی سیاست، بڑی طاقتوں کی ہو یا چھوٹی طاقتوں کی، اخلاقی حدوں اور اخلاقی نقد و نظر سے دور ہوتی جا رہی ہے۔برّصغیر میں جو شاعری ہو رہی ہے اس میں سے بہت سے شعراء ان سے آنکھ ملا رہے ہیں۔ان نقادوں کی اخلاقی غیرت کو کیا ہوا؟ ابھی اچھی تخلیق کی ہم نوائی مری نہیں وہ خود کو منوا لے گی۔

اسمیں شک نہیں کہ ادب نے انسانوں کو شعور اور ذہنوں کو فکر عطا کی ہے ساتھ ہی ساتھ ہماری اردو تنقید نے ادب کو زندگی دی اور فنکاروں کو اونچا اٹھایا اس شہر کی ادبی رفتار کا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں مالیگاؤں کے شعراء بڑی بے نیازی سے اپنے سفر پر آج بھی گامزن ہیں

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا

فنکار، اپنے فکری نظریات کو کبھی بدلتا نہیں فنی رچاؤ کے مرحلوں میں فکری نظریہ لطیف ہو کر لفظوں کے پیکروں میں اترتا ہے شاعری میں آواز اور احساس کی گونج الگ بات ہے ہر شاعر اپنے عصر کے فنکاروں کے اثرات قبول کرتا ہے کہیں کہیں اس کی گونج بھی سنائی دیتی ہے لیکن کوئی خیال ایسا نہیں ہے جس کو ہمارے پیش رو نے بیان نہ کیا ہے۔۔۔۔کائنات خود کو دُہراتی ہے قدرت خود قدیم ہے اپنے آپ کو دُہراتی ہے موسم بہار میں پت جھڑ ہوا ایسا نہیں بلکہ بہار میں پھول ہی کھلتے ہیں بقولِ بابائے اردو مولوی عبدالحق:

"۔۔۔ادب میں نیا اور پرانا کوئی چیز نہیں جس ادب میں تازگی، جدّت اور گہرائی ہے۔خواہ وہ دو ہزار برس پہلے کا کیوں نہ ہو نیا ہے اور وہ ادب جسمیں یہ خوبی نہیں، خواہ وہ آج ہی کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو پرانا ہے۔۔۔"

یہ سچ ہے کہ فریاد کی کوئی ''لے'' نہیں اس مصرعہ کو سمجھنے میں اکثر فن کار دھوکا کھا گئے ہیں۔ ''نالہ و فریاد'' کی خوبی اس کی تاثیر پر موقوف ہے اس کے لئے تصنع درکار نہیں اور شاعری کا بنیادی تصور تو میرے نزدیک یہی ہے اس قسم کی شعوری کوشش سے ادب کا کچھ بننے بگڑنے والا نہیں ہے شاعری میں انفرادی شناخت زندہ علامت کی صورت میں قائم ودائم رہتی ہے۔

میں اسے مان گیا قامت وقد رکھتے ہوئے
اور کیا مجھ سے میرا سروِ رواں چاہتا ہے

صابر زاہد

اکثر نقاد اس بات کا رونا روتے ہیں یا یہ کہتے نہیں تھکتے۔۔۔۔ ''ترقی پسند ادب خودکشی کر چکا ہے یا داستانِ پارینہ بن چکا ہے۔'' بڑا عجیب لگتا ہے میں یہ کہتا ہوں کہ ترقی پسند شعراء، ادباء نے جو فن پارے ادب میں پیش کئے ہیں تم اُنہیں کس خانے میں رکھو گے آج بھی زبان پر فیضؔ، مجروحؔ، جاں نثار اختر، جذبیؔ اور دیگر بیشتر ترقی پسند شعراء کے اشعار دلوں کو گرماتے ہیں اس کا کیا کیا جائے گا۔۔۔۔۔ ''ادب کے کمبھ میلے'' میں۔۔۔۔ اس قسم کا اظہار کر کے '' ادبی کنڈ'' میں اشنان کرنا کہاں کی دانشمندی ہے بلکہ بیشتر ترقی پسند ادیب وشعراء کی تخلیقات کلاسیکی ادب میں شمار ہو چکی ہیں۔

یوں تو ادب میں عیوب ونقائص پر اظہار خیال کرنا بہت آسان عمل ہے ادبی مفکروں کا کہنا ہے کہ محاسن کی تلاش مشکل کام ہے کسی کے چہرے پر کالا داغ ہو تو کوئی ٹوک سکتا ہے کہ یہ داغ ہے لیکن چہرے کی کتاب کو پڑھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے

ان سے پوچھو کبھی چہرے بھی پڑھے ہیں تم نے
جو کتابوں کی کیا کرتے ہیں باتیں اکثر

جان نثار اختر

■ ■ ■

ادب میں تنقیدی رویوں کی چند مثالیں

ہندوستان کی دو مقدس الہامی کتابیں ہیں، ''دیوانِ غالبؔ اور مقدس وید''

عبدالرحمٰن بجنوری نے محاسنِ کلامِ غالبؔ کی ابتداء اس جذباتی رشتے سے کی ہے۔ تقدس کے لحاف میں لپٹی ہوئی ایک بندۂ محتاج کی غلو پر مبنی تحریر نظر سے گذرتے ہی غالبؔ کی فحش اور متبذل شاعری کے تمام برہنہ پیکر سامنے آجاتے ہیں جو بذاتِ خود غالبؔ کی عظیم شاعری کے دامن پر ایک بدنما داغ کی حیثیت سے تسلیم کئے جا چکے ہیں۔۔۔ کیا مقدس کتابیں بھی اپنے دامن میں ایسی خرافات کے باوجود خود کو مقدس تصور کرنے میں اپنی اعانت کر سکتی ہیں۔

ادب میں عریانیت کا بیباک اظہار بھی ادبی نکتہ سنجی کی حدوں تک جائز قرار دیا جا سکتا ہے لیکن مقدس لفظ کے قفس میں کیا یہ عریانیت بھی باب تقدس میں داخل ہو کر مقدس تصور کی جا سکتی ہے؟ تقدس نام ہے عریانیت اور سفلی خواہشات سے پرہیز کا۔۔۔ جبکہ دیوانِ غالبؔ ہو کہ وید۔۔۔ دونوں کا دامن اس عیب سے پاک نہیں ہے لیکن عقیدت کے غلو میں ڈوب کر مرحوم نقاد عبدالرحمٰن بجنوری کی بشری مجبوری پر ادبی مجبوری زیادہ غالب نظر آتی ہے۔ یہ سرور عقیدت شعوری اور نیم شعوری یا شعوری تنقید، تنقیدی ضابطوں کی سنگلاخ وادیوں میں تجزیہ، فکر و فن کے ضوابط کا قتل زیادہ اور عدل کم دکھائی دیتا ہے۔ تنقیدی ادب سرد۔۔۔۔۔۔ غیر جانبداری کا غیر جذباتی تجزیہ پیش نہ کرتے ہوئے حقائق کشی کے ضمن میں داخل ہو جاتا ہے۔

میرؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے آل احمد سرورؔ لکھتے ہیں :

''۔۔۔ اس رنگ میں کبھی کبھی اوپری نظر میں بڑا سپاٹ پن ہوتا ہے مگر غور سے دیکھا جائے اور شعر کو دوہرایا جائے تو اس کی تہہ داری کا راز نکلتا ہے اس میں تکرار بہت ہے مگر یہ وہ تکرار ہے جو مقدس صحیفوں میں بھی پائی جاتی ہے ''نے'' کی صدا میں فریاد کی ''لے'' تو ہوگی ہی۔۔۔''

اس میں شک نہیں کہ مقدس صحیفوں میں بھی تکرار ہے قرآن ہی کو لیجئے اس میں آیات بظاہر مکرّر آتی ہیں۔۔۔ ان میں کیا نکات پائے جاتے ہیں۔۔۔ وہ نکات اور محل وقوع میرؔ کی شاعری میں

کہاں۔۔۔؟ قرآن کی ہر تکرار میں ایک نہ ایک بات پوشیدہ ہے دیدۂ بینا کے لئے یہ تکرار برائے تکرار نہیں ہے بلکہ اس میں معانیٔ ذہنیہ کے ساتھ محل وقوع کا پس منظر بھی ہے۔۔۔ میرؔ کی شاعری تکرار برائے تکرار کے وہم کا ازالہ نہیں کر پاتی جبکہ قرآن۔۔۔ تکرار برائے تکرار کے وہم کا ایک اچھا خاصہ جواز و ازالہ فراہم کرتا ہے لیکن مقدس صحیفوں میں جو فنی حسن و کمال ہے وہ میرؔ کی شاعری میں کہاں۔۔۔؟ انظر کیف نصّرف الایاتِ لعلھم یفقھون ۔(پارہ ۷ آیت نمبر ۶۵ رکوع ۱۴) دیکھو ہم کیونکر طرح طرح سے آیتیں بیان کرتے ہیں کہ کہیں ان کو سمجھ ہو۔ ترجمہ کنز الایمان) ۔۔۔[دیکھو کس طرح (ہیر پھیر) کر اپنی آیتیں بیان کرتے ہیں تا کہ وہ سمجھیں ہر ترتیب میں ایک خاص حکمت ہے۔] ولقد صرفنا فی ھٰذالقران لیذکرو۔ (پارہ ۱۵ آیت نمبر ۴۱ رکوع ۵) ۔۔۔ (بے شک ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان فرمایا کہ وہ سمجھیں۔ ترجمہ کنز الایمان) ۔۔۔[ہم نے اس قرآن میں باتیں مختلف اسلوبوں سے بیان کی ہیں تا کہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔] اسلئے آل احمد سرورؔ صاحب کو انسانی کلام کا لحاظ کرتے ہوئے یہ جملہ نہیں کہنا چاہیئے تھا۔۔۔ یہ وہ تکرار ہے جو مقدس صحیفوں میں پائی جاتی ہے۔۔۔ جو صرف عجلت پسندی کا مظاہرہ ہے جس میں آل احمد سرورؔ صاحب کا وجدان صرف تحسین کلام کے سوا کچھ بھی نہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے باقیؔ کی شاعری کا احاطہ کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

"۔۔۔ باقیؔ، میرؔ اور پیروئی انشاءؔ سے اتنے ہی نا مطمئن تھے جتنے پیروئی فراقؔ یا پیروئی جگرؔ یا تتبع یگانہ سے۔۔۔ نئی غزل یا نئے رجحان تک پہنچنے کا راستہ ان کے سامنے نہ تھا۔۔۔"

فاروقی زیب غوری کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں۔

"۔۔۔ روایت جس نہج اور جس انداز سے ان کے زمانے میں دستیاب تھی وہ نا کافی تھی بلکہ شاید وہ اصل روایت تھی ہی نہیں کیونکہ اصل روایت اور ان کے درمیان کئی طرح کے پردے بھی حائل تھے۔۔۔"

اس پیراگراف میں صرف پیروی میرؔ، پیروی انشاء، پیروی جگرؔ یا تتبع یگانہ کا ذکر نہ کر کے اس بات کا اظہار کرنا مقصود تھا جو انھوں نے باقیؔ کے سلسلے میں لکھی تھی۔۔۔ صرف روایت کا لفظ ڈراپ کر کے بڑی

صفائی کے ساتھ لکھ جانا فاروقی صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔اس مضمون کے بعض جملے قابلِ غور ہیں۔

"۔۔۔شاعراور متکلم کی شخصیتوں کا مکمل انضمام وادغام زیب غوری کا کارنامہ ہے۔"

"۔۔۔انفرادی شخصیت کے قیام واستحکام کی شکل کلاسیکی غزل میں نظر نہیں آتی۔۔۔" اتنی بڑی بات کہہ جانا فاروقی ہی کا کارنامہ ہے۔

اب باقی کے تعلق سے یہ جملے ملاحظہ فرمایئے۔

"۔۔۔ان غزلوں کی نمایاں صفت ایک یہ بھی ہے کہ متکلم کی شخصیت بظاہر بدلتی رہتی ہے لیکن دراصل ایک ہی ہے۔۔۔"

مختصر یہ کہ ادب میں نثری یکسانیت کی یہ تکرار کیا معنی رکھتی ہے ادب میں اس قسم کی جگالی کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا جاسکتا۔۔۔اظہار خیال کی کاربن کاپی اچھی نہیں لگی یا فاروقی صاحب کے پاس کہنے کو کچھ نہیں رہا۔

فضیل جعفری صاحب کے چند جملے قابلِ غور ہیں جو انھوں نے زیب کی شاعری پر لکھے ہیں۔

"۔۔۔زیب کو موضوعات کی ندرت اور اپنے اسلوب کی انفرادیت کا احساس آخری دم تک رہتا ہے۔۔۔"

یہ بات صرف زیب غوری پر ہی کیا منحصر۔۔۔اب تو ہر غیر معمولی شاعر کو اپنے موضوعات کی ندرت اور اسلوب کی انفرادیت کا احساس آخری دم تک رہتا ہے۔

"۔۔۔انفرادی حسّیت کے ساتھ اجتماعی حسّیت کے شاعر ہیں۔۔۔"

یہ جملہ ہر غیر معمولی فنکار کے ساتھ چسپاں کیا جاسکتا ہے۔۔۔اس قسم کے جملے زیب ہی کیا کسی بھی فنکار کی شاعری کا احاطہ نہیں کرتے ہیں۔

"۔۔پیرایہء اظہار میں، ہمیشہ ایک طرح کی نرمی، نغمگی اور پُر تکلف نفاست نظر آتی ہے۔"

حالی سے لے کر آج تک تمام نقادوں نے ذرا سے ردّ وبدل کے ساتھ اس قسم کے جملے ہر غیر معمولی شاعر کے تعلق سے لکھے ہیں جو کہ اکثر وبیشتر پڑھنے میں آتے ہیں۔اس قسم کے جملوں سے ہمارے ادب کو کب چھٹکارا ملے گا؟ کلیم الدین کا یہ اعتراض بجا تھا کہ ہماری اردو تنقید حالی کی تنقید سے آگے نہیں جاسکی۔

فضیل جعفری صاحب بانؔی کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"۔۔۔۔"جدیدیت" محض ہمارے ممدوح کے یہاں نظر آتی ہے۔۔۔۔لیکن ممدوح کے بدلتے ہی لہجے کی انفرادیت، موضوعات کی ندرت، اسلوب کی تازگی، زندگی سے قربت اور جدید حسیت وغیرہ تمام خصوصیتیں جن سے پہلے شاعر کو نوازا گیا تھا۔۔۔۔ ہو بہو دوسرے شاعر کے یہاں نظر آنے لگتی ہیں ۔۔۔۔مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں اس پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے ۔۔۔۔ ہمارے یہ مشاہیر ،ایک درجن سے زائد شعراء کے یہاں وہ خصوصیات دیکھ چکے ہیں۔"

جن کا ذکر انھوں نے بانؔی کے سلسلے میں کیا ہے۔۔۔۔؟ فضیل جعفری کے کہنے کا مقصد یہی ہے کہ ایسے جملے ادبی بازار میں تھوک بھاؤ سے مل جاتے ہیں۔

جبکہ وہ خود اس کے شکار نظر آتے ہیں وہی بات وہ زیبؔ کی شاعری پر لکھ چکے ہیں۔۔۔۔ جو ہو بہو اب دوسرے کے یہاں نظر آتی ہے۔۔۔۔ خدارا ہماری تنقید کو یکسانیت کی فضا سے کوئی بچائے اور ساتھ ہی ساتھ شکایتی لب و لہجہ سے بچائے۔۔۔۔ ہمارا تنقیدی رویہ کتنا سکڑ چکا ہے۔۔۔۔لیکن پھر سوال پیدا ہوتا ہیکہ شاعری میں یہ چیزیں قدر مشترک ہوتی ہیں۔۔۔۔ میرؔ سے لے کر عصر حاضر کے فنکاروں کے یہاں شاعری میں یہ خصوصیات موجود ہوتی ہیں اس کے علاوہ اور ہم لکھ بھی کیا سکتے ہیں۔ (جن خصوصیات کا رونا فضیل جعفری نے رویا ہے۔)

سلیم شہزاد زیب غوری کی شاعری پر یوں رقم طراز ہیں "۔۔۔۔آتش و آب و خاک و باد اردو شاعری کے وجود و قوع کا سب سے بڑا سبب قرار دیئے جا سکتے ہیں اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان چار عناصر کو ہمارے شعراء نے فلسفیانہ آمیزش ہی کے ساتھ برتا ہے اگرچہ ان کی معنویت زندگی کے استعاراتی معنوں سے زیادہ انھوں نے تلاش نہیں کی۔۔۔۔"

اس پیراگراف کو پڑھنے کے بعد پھر وہی تشنگی ذہن میں گردش کرنے لگتی ہے۔ جس کا اشارہ محترم نقاد سلیم شہزاد نے زندگی کے وسیع تر معنی کی طرف اشارۂ محبوب کے انداز کو اپنا کر کیا ہے۔ سلیم شہزاد صاحب جو خود کو تنقیدی امور میں اکثر مافوق بشر تصور کرتے ہیں کاش اپنے آفاقی شعور و ادراک کے ذریعے یہ بتاتے کہ زندگی کا وسیع تر استعاراتی مفہوم ان کے نزدیک کیا ہے تو قاری کو نفس مضمون تک

پہنچنے میں آسانی ہوتی۔صرف خلائی تیروں کے استعمال سے مقصدی یا غیر مقصدی پرندے ہاتھ آیا نہیں کرتے۔۔۔۔ویسے بھی سلیم شہزاد کی تحریر غیر واضح اور ابہام کی حامل ہے جس کے لئے وہ کافی مشہور ہیں ۔۔۔۔۔ اسی طرح ادبی دریدہ دہنی کی ایک اور مثال جوانھوں نے جشن ''بے باک'' ستمبر ۲۰۰۳ء کے موقع پر پیش کی تھی۔۔۔۔''دھوبیوں اور درزیوں کے لئے نہ افسانے لکھے جاتے ہیں نہ پڑھے جاتے ہیں۔۔۔۔'' قاضی مشتاق احمد نے زبردست اعتراض کیا ہے۔۔۔۔وہ لکھتے ہیں : ۔۔۔۔سچا فن کار زندگی کو قریب سے دیکھتا ہے اسمیں دھوبی، درزی، رکشاوالا، ٹیکسی والا، مزدور اور کسان سب آتے ہیں کہانیاں ان ہی کی زندگی سے جنم لیتی ہیں۔۔۔۔ مجھے امید ہیکہ تمام نام نہاد دانشور، ادباء وشعراء اور ناقدین زمین پر چلنے والے انسانوں سے تعلق جوڑنے کی کوشش کریں گے کیونکہ ان تمام لوگوں کی حمایت پر ہی ادب کی بقا کا دارومدار ہے۔

شعر میرے ہیں سب خواص پسند پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

آیئے اخیر میں مشفق خواجہ کی طرف آپ کو لے چلوں

''۔۔۔۔میں نے ساقی کی نظم ''مستانہ ہیجڑا''۔۔۔۔آٹھ مرتبہ پڑھی۔۔۔۔پہلی مرتبہ میں اس کی نغمگی میں گم ہوگیا دوسری مرتبہ نظم پڑھی تو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی تصویر دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔مستانے کا سراپا، اس کی مکمل شخصیت آنکھوں کے سامنے آگئی تیسری مرتبہ نظم پڑھی تو الفاظ بادل کی طرح چھٹ گئے اور معانی کا سورج طلوع ہوا۔۔۔۔طربیہ فضا کو یکا یک المیہ فضا میں تبدیل کر دینا شاعری نہیں ماورائے شعر ہے۔غضب کی نظم ہے۔۔۔۔۲۹ مہینوں بعد ساقی اگر ایسی نظم نہ لکھتے تو ساقی کو شاعری ترک کر دینے کا مشورہ دیتا۔۔۔۔الفاظ صرف اصوات کی صورت میں سامنے آئے ایسے کھردرے لفظوں میں ایسا رس اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔۔۔۔نظم کے الفاظ آنکھوں کے راستے نہیں کانوں کے راستے ذہن تک پہنچتے ہیں۔۔۔۔''

''مستانہ ہیجڑا'' جواز میں شائع ہوئی تھی پوری نظم بیانیہ ہے اسے آپ بھی پڑھئے کہنے کو یہ ایک نامرد کا نوحہ ہے۔۔۔۔(جواز ۱۵ مئی ۱۹۸۹ء) میرؔ نے مرد کا نوحہ کچھ اس طرح بیان کیا ہے۔

ایک جھونکا ہوا کا آیا میرؔ اور پھر میں غبار بھی نہ رہا

انہیں معلوم نہیں کیسی کیسی نابغہ رُوزگار شخصیتوں کو زمیں کھا گئی۔۔۔۔زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

''مستانہ ہیجڑا''

مولا تری گلی میں
سردی برس رہی تھی
شاید اسی سبب سے
مستانہ ہیجڑا بھی
وہسکی پہن کے نکلا
ٹینس کے بال
کستی انگیا میں
کس کسا کے
پستاں بن گئے تھے
شہوت کے سرخ ڈورے
سرمہ لگانے والی
آنکھوں میں تن گئے تھے
اک دم سے
چلتے چلتے
اس نے کمر کے جھٹکے سے
راہ چلنے والے
شُہدوں، نَدیدوں، بانکوں
سے التفات مانگا
اور دعوت نظر دی
اس کے صنم کولہوں نے
آگ اور لذت
خالی دلوں میں بھر دی
اس نے ہتھیلیوں کے گدّے
رگڑ رگڑ کے
وہ تالیاں اڑائیں
مہندی کے رنگ
تتلی بن کر ہوا میں
اپنے پر تولنے لگے تھے
پھر جاندار ہونٹوں سے
پان دار بوسے
چھن چھن چھلک چھلک کے
ہر منچلی نظر میں
رس گھولنے لگے تھے
وہ آج لہر میں تھا
مسّی کے چھب دکھا کر
نتھنے پھلا پھلا کے

انگلی نچا نچا کے
اس نے مزے میں آ کے
ہنس کر کہا کہ سالو
میں تو جنم جنم سے
اپنے ہی آنسوؤں میں
ڈوبا ہوا پڑا ہوں
یعنی ضمیر عالم کے
تنگ مقبرے میں
زندہ گڑا ہوا ہوں

مشفق خواجہ کے نزدیک بھلے ہی اس نظم کی اہمیت ہو یا وہ اس نظم کے فنی حسن جمال میں کھو گئے ہوں مگر اس کے معنی اور مفہوم کے سلسلے میں اس طرح غلط تاویل سے کام لینا کہاں تک درست ہے۔ اظہارِ رائے کی آزادیٔ کا یہ مطلب تو نہیں آدمی بیہودہ گوئی کا خوگر ہو کر رہ جائے اس سے ان کی ذہنی عیاشی کا اندازہ ہوتا ہے حالانکہ یہ نظم خلاقانہ قوت کا مظہر نہیں ہے۔ پوری نظم ''ارادے'' کے زور پر کہی گئی ہے ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اس نظم کو پڑھنے کے بعد ساقی کو شاعری ترک کر دینے کا مشورہ دیتے۔۔۔۔۔ اس نظم کے مقام و مرتبہ یا اس کی اہمیت بتانا مقصود ہے تو اس کو ایک حد تک ہی رکھنا چاہیئے تھا۔ نظم کے مرتبے یا حیثیت کے مطابق اس کا مقام متعین کرنا چاہیئے تھا۔۔۔۔۔ کیا ماورائے شاعری اسی کا نام ہے جو مشفق خواجہ نے بیان کی ہے۔ اہل نظر کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس قسم کی چاپلوسی کرنے والوں کو آئینہ دکھانا چاہیئے۔

میری سمجھ سے باہر ہے خواجہ مشفق کی یہ شانِ بندہ نوازی۔۔۔ خواجہ صاحب اور خواجہ سرا میں کیا دلی رشتہ ہے وہ خود ہی جانیں۔۔۔ کیا عریانیت کا بیباک اظہار ہی ادب ہے؟۔۔۔ اگر یہ ادب ہے تو مغربی ادب ہے۔۔۔ مشرقی ادب نہیں۔۔۔

برہنہ حرف گفتن کمالِ گویائی ایست　　حدیث خلوتیاں جز بہ رمز ایماں
خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

یہ ہے مشرقی مزاج۔۔۔مشرقی شاعری۔۔۔اور مشرقی ادبی تہذیب۔۔۔مشرقی پاک ذہنیت ہمہ گیر طور پر ساقی فاروقی کو حدِ ادب سے خارج قرار دیتی ہے۔مستانہ ہیجڑا کے علاوہ جس کی ایک اور مثال نظم ''باکرہ'' بھی ہے اس نظم کو پڑھ کر گھن اور متلی آنے لگتی ہے۔۔۔اشارۃً عرض ہے تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔۔۔خواجہ صاحب کم سے کم آپ اپنے نام ونسبت کے تقدس کا لحاظ رکھتے۔۔۔ساقی فاروقی کی عریاں نظم کے اظہار خیال میں۔

ادب سے معمولی دلچسپی رکھنے والا آدمی بھی اتنی سطحی رائے نہیں دے گا۔مشفق خواجہ پورا تاریخی، تنقیدی شعور وادراک نہیں رکھتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے ادبی تنقیدی روایت سے واقف نہیں ہیں یا اگر واقف ہیں تو جان بوجھ کر اپنی بے تکی باتوں کا اظہار کر رہے ہیں۔۔۔یا پھر بنیاد پرست انسان ہیں۔وہ ایسا لکھ کر یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ۔۔۔صرف انہیں داد وتحسین سے نوازا جائے گا۔۔۔جو کہ کسی بھی حماقت آمیز حرکت سے کم نہیں ہے ان کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابھی اس قابل نہیں ہوئے وہ اپنی رائے کو مستحکم طور پر پیش کر سکیں۔۔۔اگر ان کی دلفریب تحریروں سے قارئین خوش ہو جائیں گے ۔۔۔یا جھوم اٹھیں گے ۔۔۔یا ایسی رائے دے کر وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ادب میں میں نے بہت بڑا تیر مارا ہے تو یہ ان کی بھول ہے۔۔۔ان کی اس بھول کو میں نادانی ہی کہوں گا ۔۔۔انہیں اپنی اس بھول پر شرمندہ ہونا چاہیئے ۔۔۔ہماری اردو تنقید کو کس طرح پامال کیا جا رہا ہے اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں۔۔۔اتنے کند ذہن کہ سطحی نظم آٹھ (۸) مرتبہ پڑھنے کے بعد ہی ان پر معنی کے دروازے کھلتے ہیں۔۔۔اور انہوں نے سطحی جذباتیت کا اظہار کر کے اپنی ادبی ساخت کو نقصان پہنچایا ہے۔۔۔ادب میں اس قسم کا بھونڈا مذاق نا قابلِ برداشت ہے۔۔۔خوشنما الفاظ کے پیچھے ان کی سطحی جذباتیت کو دیکھا جا سکتا ہے ۔۔۔جو ایک کھلا ہوا فریب ہے۔

ساقی کی نظم ''مستانہ ہیجڑا'' نہ تو آٹھ مرتبہ پڑھنے کے لائق ہے نہ اس کی نغمگی میں گم ہونے جیسی کوئی بات ہے نظم کا عنوان پڑھتے ہی اس کا سراپا سامنے آجاتا ہے یہ نظم بیانیہ ہے یہ نظم ایسی نہیں ہے کہ

تیسری مرتبہ پڑھنے کے بعد ہی معانی کا سورج طلوع ہوتا ہے بلکہ پہلی مرتبہ پڑھنے سے اس کے معنی خود بخود کھلنے لگتے ہیں طربیہ فضا کو یکا یک المیہ فضا میں تبدیل کرنے والا انڈو پاک میں ایک ہی شاعر تھا وہ تھا سلیمان خطیب۔۔۔۔!داد دینے کا طریقہ بھی سطحی اور ہلکا ہے جو ادب میں تعلقات کی بنیاد پر استوار ہے نہ کہ تخلیق پر۔۔۔۔ضمیر عالم کے تنگ مقبرے میں ''زندہ گڑا ہوں'' بھی قابل گرفت ہے مختصر یہ کہ میں ہنس پڑا۔۔۔۔خواجہ کی بات پر نظم تاخیر سے موصول ہونے کے سبب اپنے مقام پر شائع نہ ہوسکی مدیر جواز کو اس کا افسوس ہے۔۔۔۔اور مجھے حیرت ہے۔۔۔۔۔

ساقی خود اپنے آپ کو ادب کا وزیر اعظم لکھتے ہیں۔اس پر مزید لکھنا بے کار ہے ۔۔۔۔۔۔وہ اتنے بخیل ہیں کہ اپنی ذات کے سوا انہیں کوئی دوسرا فن کار دکھائی نہیں دیتا۔اب ان کو کون سمجھائے۔ بقول رشید حسن خان۔۔۔۔۔''طبیب کے ہاتھ میں شفا نہ ہو تو اس کے علم کا کچھ حاصل نہیں۔۔۔۔''

نشاط کی نظم ''رین نظارے'' ساقی کی نظم سے بہت بلند ہے کہیں بھی فحاشی (Vulgarity) نہیں ہے۔نشاط کی نظم ایک سماجی نکتہ نظر (Social constructive view) کی ترجمانی کے علاوہ ایک تخلیقی بصیرت کے ساتھ اپنے انداز میں بہتی ہوئی تہذیبی رنگ ڈھنگ کے ساتھ نظر آتی ہے۔اسے نظم کہتے ہیں۔مزید کسی ادبی و لفظی تشریح کے نظم ''رین نظارے'' ملاحظہ فرمایئے۔۔۔۔۔یعنی وہی بات

گلدستہ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

آج سے ۶۰۔۶۵ برس پہلے نشاط مرحوم کی نظم ''رین نظارے'' پڑھئے صوتی آہنگ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

''رین نظارے''

مندر کی سیڑھیوں پر اشلوک گنگنا تا
پانی میں اک پجاری خاموشئ فضا میں
لٹیا ڈبو رہا ہے نغمے سمو رہا ہے
چٹیا بھگو رہا ہے محجوبئ نظر سے
گیتا کے کچھ مقدس کچلا ہوا ارادہ

سینے میں کلفتوں کے
نشتر چبھو رہا ہے
بل دے کے اپنی دھوتی
وہ یوں کھنگالتا ہے
جیسے کثافتوں کے
دریا بلو رہا ہے
ناپاک ولولوں کے
دل میں لئے دھندلکے
نیرنگی سحر سے
مسرور ہو رہا ہے
شہوت پرستیوں سے
لبریز اس کی خلوت
دل جاگتا ہے اس کا
ایمان سو رہا ہے
بازار کی گلی میں
اک بیسوا حسینہ
کھڑکی پہ چپکے چپکے
پردہ گرا رہی ہے
کچلا ہوا تبسم
مسلی ہوئی جوانی
بدمستیوں سے اب تک
کچھ لڑکھڑا رہی ہے

پیاسی جوانیوں کو
زہریلے گھونٹ دے کر
شیشے اٹھا رہی ہے
شمعیں بجھا رہی ہے
پھر سے سجا رہی ہے
اپنے چھتر پلنگ کو
بیبا کیوں میں ڈوبی
چادر ہٹا رہی ہے
اعضا کو تانتی ہے
کروٹ بدل بدل کر
اینٹھی ہوئی رگوں پر
مرہم لگا رہی ہے
پچھلے پہر کے گاہک
کو گھر روانہ کر کے
جب صبح ہو رہی ہے
یہ سونے جا رہی ہے
اک پیٹ کی ہے ماری
اک نفس کا ہے مارا
کس کو کہیں کمینہ
حیران ہے نظارہ

نامکمل.....

■■■

اے عصائے موسوی در عصر ما

امام احمد رضاؒ

(آمد ۱۸۵۶ء .... رخصت: ۱۹۲۱ء)

نعت کی اہمیت ہر دور میں مسلّم رہی ہے ۔قرآن و احادیث کا گہرا مطالعہ بھی نعت گو شعرا کیلئے ممد و معاون رہا ہے۔ بہت سے نعت گو شعراء شریعت کی گرفت سے نہیں بچ سکے کیونکہ وہ عالم نہیں تھے ۔اعلیٰ حضرت امام احمد رضا عالم بھی تھے، عاشقِ رسول ﷺ بھی ۔۔اسلئے ان کے یہاں کوئی شعر ایسا نہیں ملتا جس میں غلو کی حد تک پہنچ گئے ہوں ۔نعت میں آدابِ محبت کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے اور حضور اکرم ﷺ سے محبت و عقیدت مسلمانوں کا جز و ایمان ہے ۔حبّ رسول کے مختلف انداز ہمیں حضرت حسّان بن ثابت سے لے کر امام احمد رضا تک ملتے ہیں ۔صحابہ کرام اور بزرگانِ دین عشق رسول ﷺ کے جذبے سے سرشار تھے ۔اسی عشق و محبت کے سہارے عاشقانِ رسول کائنات پر چھائے ہوئے ہیں۔

وَاَحۡسَنَ مِنۡكَ لَمۡ تَرَ قَطُّ عَينى　　وَاَجۡمَلَ مِنۡكَ لَمۡ تَلِدِالنِّسَاءُ
خُلِقۡتَ مُبَرَّاً مِّنۡ كُلِّ عَيۡبٍ　　كَاَنَّكَ قَدۡ خُلِقۡتَ كَمَا تَشَاءُ

(حضرت حسان بن ثابت)

(اے حسن و جمال کے ماہتاب و آفتاب آپ سے بڑھ کر حسین و جمیل میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا اور آپ سے بڑا صاحبِ جلال و کمال دنیا جہان کی عورتوں کی آغوش میں پیدا ہی نہیں ہوا آپ ہر عیب سے اس طرح پاک و صاف پیدا ہوئے گویا آپ کی تخلیق آپ ہی کی مرضی کے مطابق ہوئی ۔)

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

(جامیؒ)

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گذاشتم
کاں ذات پاک مرتبہ دان محمد است

(غالب ہم نے آقا کی تعریف خدا کے سپرد کی ہے کہ (وہی) ذاتِ پاک محمد ﷺ کا (حقیقی) مرتبہ جاننے والی ہے)

تیر قضا ہر آئینہ از ترکشِ حق است
اما کشود آں زکمانِ محمد است

(غالبؔ)

(قضا کا، تقدیر کا، امر کا، ہر تیر اللہ تعالیٰ کے ترکش سے چلتا ہے لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی کمان سے)

ادب گاہیست زیرِ آسمان ازعرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جاں

(عترت بخاری)

حضور اکرم ﷺ کی مدح وثناء میں غلو نہ ہو اور ساتھ ہی ساتھ بے ادبی نہ ہو ورنہ ذرا سی لغزش مسلمان کے تمام اعمال کو ضائع کر دیگی۔ یہ پیمانہ بھی ہمیں اساتذہ کے نعتیہ اشعار سے مختلف انداز میں ملتا ہے۔ دار العلوم دیو بند کے صدر حسین احمد دیو بندی نے جب دین کی غلط تعبیر و تفسیر پیش کی تو علامہ اقبال بے چین ہو اٹھے اور یوں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

سرود برسر منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر زمقام محمد عربی است
عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
زدیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے شکایت کی کہ ایک امام صاحب روزانہ جہری نمازوں میں سورہ عبس پڑھا کرتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس امام کو بلا کر پوچھا امام نے جواب دیا یہ سورہ مجھے اسلئے عزیز ہیکہ اس سورہ میں اللہ نے حضور کو ڈانٹا (معاذ اللہ) اتنا سنتے ہی حضرت عمر نے اس امام کا سر قلم کر دیا یہیں سے ہمیں ایک معیار و پیمانہ مل جاتا ہے تحفظِ عظمت شان رسالت ﷺ کا۔ یعنی جس نے اللہ و رسول کی بات نہیں مانی وہ کھلا گمراہ ہوا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کا دور خصوصاً اسلام کیلئے بہت ہی پر فتن رہا۔ یورپ کی اسلام دشمن لابی کا

اہم مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ کسی طرح سے دینی بے راہ روی اور عقائد میں فساد برپا کیا جائے برطانوی سامراج ہمیشہ شرارِ بولہبی سے چراغ مصطفوی بجھانے کے درپے رہا ہے مگر ''وہ شمع کیا بجھے جسے روشن خدا کرے۔'' اوراب بات ہمفرے کے مقاصد سے بھی آگے بڑھ گئی بلکہ ان نظریات کی تعمیل کیلئے کئی نام نہاد دانشور مقاصدِ صیہونیت کوتقویت پہنچانے کے لئے میدان میں اتر چکے ہیں ان صیہونی عزائم کو جدید اردو میڈیا بھی سنجیدگی سے لے رہا ہے جیسا کہ عالم نقوی نے اردو ٹائمز ڈیلی اتوار کے شمارے بتاریخ ۲۰۰۳-۹-۲۸ میں نام نہاد مسلم دانشوروں کی اسلام وقرآن کے متعلق ہرزہ سرائی کا ذکر کیا ہے جدیدیت کے نام پر بعض مسلم دانشوروں نے اسلامی قوانین اور خواتین کے متعلق مساوات کی آڑ میں عریانیت کی تہذیب کا فروغ اوراس طرح کے بہت سے مطالبات بالخصوص قرآنی آیات پر نکتہ چینی کی ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلام کے خلاف عالمی سطح پر ماحول تیار کیا جارہا ہے اور نئی نسل کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے نصابِ تعلیم سے اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کو حذف کرنے کا مطالبہ شدت اختیار کر رہا ہے جیسا کہ عالم نقوی نے لکھا ہے کہ ۴، جولائی ۲۰۰۳ء کو مصر کی راجدھانی قاہرہ میں ایک کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے ایک تیونس اسکالر العفیف الاخضر نے کہا ''مسلمان اب بھی زمانہء قدیم کی فقہ کو درست سمجھتے ہیں جو غیر مسلموں کی تقلید کو حرام قرار دیتی ہے ہماری ''دینی نرگسیت'' ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ اسلام کے آنے کے بعد تمام سابقہ ادیان منسوخ ہو چکے ہیں حالانکہ چاہیئے کہ فقہء اسلامی کی ڈکشنری سے لفظ کفّار خارج کردیا جائے۔۔۔۔'' یا پھر مسلمان زندگی کے بارے میں سوچتے کم اور آخرت کے بارے میں زیادہ سوچتے ہیں۔۔۔۔آگے مزید ایک نام نہاد مسلم دانشور ڈاکٹر حیدر ابراہیم نے لکھا ہے کہ ''مسلمانوں کو اس طرح کی آیاتِ قرآنی کے سحر سے نکل آنا چاہیئے۔۔۔۔'' **کنتم خیر امتہ اخرجت اللناس** ۔۔۔۔'' تم بہترین امت بنائے گئے ہو کیونکہ اس آیت سے **نعوذ باللّٰہ** تکبر وتعلّی پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔**العیاذ باللّٰہ** ۔۔۔۔ثقافتی تجدید کے نام پر صیہونی مسیحیت کے لبادے میں یہ کہنے سے بھی نہیں چوکتے۔۔۔۔بقول عرب دانشور **Adonis** (ایڈونس) (جس کا اصل نام علی احمد سعید ہے)۔۔۔۔۔ترقی کی راہ میں پہلی رکاوٹ وحی الٰہی اور اسلام ہے (**معاذ اللّٰہ**) اسلام دشمنی کی غذا کہاں سے حاصل کرتے ہیں یہ آپ کو معلوم ہوگیا۔ یہ فکر ونظر مستشرقین یورپ کی دین ہے بہرحال سلمان رشدی کے ہم مشرب ہر دور میں پیدا ہوتے رہے ہیں امام احمد رضا کی مومنانہ

فراست نے ان کے اپنے عہد کے ساتھ ہی مستقبل میں مسلمانوں کے خلاف بچھائی گئی سازشوں کی بساط کو محسوس کرلیا تھا سازشیں تو ہر عہد میں اسلام کے خلاف ہوتی رہی ہیں۔مگر مردانِ خدا نے تحفظِ دین اور تحفظِ مسلک کی خاطر ہمیشہ ڈٹ کر مقابلہ کیا ہے۔۔۔۔لوگ ملت کے اتحاد کی بات کرتے ہیں تو انہیں اپنی تہذیبی وثقافتی وتاریخی پس منظر کو بھی پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ٹھیک ہے ملّت میں انتشار نہیں ہونا چاہیئے۔۔۔لیکن یہ اختلاف جب حدوں کو پار کر جاتے ہیں تو مردانِ خدا کو ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑا ہی ہونا پڑتا ہے اور آج بھی دین میں آزادانہ مذہبی فکر کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جیسا کہ عالم نقوی نے لکھا ہے: الفرقان کے فروری ۲۰۰۳ء کے شمارے میں۔۔۔قوم الکافرین۔۔۔کا ترجمہ۔۔۔سخت ترین حالات۔۔۔اور بقرہ کا ترجمہ۔۔۔"بیل" لکھا ہے اور ترجمہ نگار ہیں مولانا عبدالکریم پاریکھ۔۔۔مزید آگے عالم نقوی لکھتے ہیں۔۔۔مغربی تصورات کے مطابق، اسلامی نظریات سے پیچھا چھڑائیں۔

اسی طرح اردو ٹائمز نے ۲۶، دسمبر ۲۰۰۳ء میں جمعہ ایڈیشن کے اداریئے میں اسلام دشمنی کے تعلق سے رونالڈ کیسلر کی کتاب سی آئی اے کی جنگ سے اس بات کا اظہار کیا ہے۔۔۔یہ کتاب مسلمانوں کی دوستی میں نہیں اسلام دشمنی میں لکھی گئی ہے صیہونیت کے ذہنی پس منظر کو اس میں اجاگر کیا گیا ہے نقلی علماء ہر دور میں طاغوتی طاقت کی ہم نوائی کیلئے پیدا کئے جاتے ہیں ان کا ایک ہی کام ہے الیھود و النصاریٰ الذین اشرکو، کی ولایت سے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کی بیعت لیتے ہیں یہ قرآن میں تحریف تو نہیں کرسکتے لیکن اصطلاحات قرآنی کی غلط مفسدانہ تاویل کرتے رہے ہیں۔۔۔مختصر یہ کہ علمائے حق کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا ان کا مقصد ہے اور یہ اس کی تکمیل اسلام پر تنقید کے ذریعے کرتے رہتے ہیں۔

"سرور ٹائمز" ستمبر کے شمارے میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ ۱۱ ستمبر (W.T.C.) کے واقعہ کے بارے میں بولنے والے ہزاروں خطیبوں اور موذنوں کو گھر کا راستہ بتادیا گیا۔۔۔سعودی عرب میں موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ وہاں کے مدارس کے نصاب سے یہود ومشرکین پر لعنت والی آیات خارج کردی گئی ہیں۔عرب ممالک کے نام نہاد اخبارات مسلمانوں کو اپنی تہذیب اور فکر کو بدلنے کا لیکچر دے رہے ہیں دین کی شکل مزید بگڑتی جارہی ہے ہر زمانے میں اسلام پر حملہ ہوتا رہا ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اسی لئے مولانا ظفر علی خان (زمیندار کے ایڈیٹر) نے اپنے جذبات کا اظہار

کچھ اس طرح کیا تھا۔

عبدالعزیز کیا ہے فقط ایک حرم فروش
برطانیہ کی زلف گرہ گیر کا اسیر

موجودہ برسرِ اقتدار شاہی خاندان کا جدِ امجد شاہ عبدالعزیز جس نے فرنگی عزائم کو تقویت پہنچا کر اصولِ دینیہ سے انحراف کیا اور حجازِ مقدّس میں اسلامی شعائر کو مٹایا۔۔۔مزید اپنی بات کو ہمفرے کے حوالوں سے لکھتا ہوں، برطانوی جاسوس "ہمفرے کے اعترافات" میں اس کا اظہار یوں ملتا ہے وہ لکھتا ہے۔

(۱) پیغمبر اسلام کی اہانت کا سہارا لے کر اور شرک و بت پرستی کو مٹانے کے بہانے مکّہ، مدینہ اور دیگر شہروں میں جہاں تک ہو سکے مسلمانوں کے مقدّس مقامات کو تاراج کرنا۔

(۲) اسلامی ممالک میں فتنہ و فساد اور شورش و بدامنی پھیلانا۔

(۳) اسلام کی تعلیمات اور قرآن و حدیث پر مسلمانوں کا اعتماد متزلزل کرنا۔

(۴) مسلمانوں میں روحِ عمل اور ولولہ انگیزی ختم کرنا اور ان میں انتشار پیدا کرنا۔

(۵) مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں میں خودسری اور مذہب بیزاری کی ترویج اور انھیں اسلام کے اصول و مبادی کی سچّائی کے بارے میں بدظن کرنا۔

(۶) قرآن میں کمی بیشی پر شاہد احادیث اور روایات کی رو سے ایک جدید قرآن کی نشر و اشاعت۔

یہ سب باغیانہ تحریکیں برطانوی سامراج ابن عبدالوہاب نجدی کے ذریعہ پھیلائی گئیں۔ جہاں تک جدید قرآن کی نگارش اور خانہ کعبہ کے انہدام کا سوال تھا وہ ابن عبدالوہاب نجدی کے بس سے باہر تھا۔ کیونکہ اس وقت کے سیاسی حالات اس بات کے متقاضی نہیں تھے۔ عبدالوہاب نجدی نے اسلام کی جڑیں کمزور کرنے کیلئے پوری کوشش کی۔ وہ اس میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ اسی طرح اعدائے اسلام کا ایک گروپ ہندوستان میں موجود ہے۔ کلمہ گو مفتریوں نے جو بظاہر مسلمان تھے، شانِ رسالت میں گستاخیاں کیں۔ ان مولویوں کی ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی اظہر من الشمس ہے۔ ان کے قلم کی سرکشی اور دیدہ دلیری نے اسلامی شعائر کو پراگندہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ کوئی رسول ﷺ کے علم کو جانوروں کے علم کے برابر ٹھہراتا۔ جبکہ خدائے تعالیٰ اپنے محبوب کے علم کے بارے میں یوں ارشاد فرماتا ہے ("خدا کے پاس علم غیب ہے اور وہ اپنے غیب کا علم کسی کو تفویض نہیں کرتا سوائے اپنے اس برگزیدہ

رسول کے جس کی رضا وہ چاہتا ہے۔'' ترجمہ کنز الایمان) معاذ اللہ کوئی کہتا ہے آپ مر کر مٹی میں مل گئے حالانکہ خدا نے مٹی پر انبیائے کرام کے جسموں کو نقصان پہنچانا حرام کر دیا ہے۔کوئی محبوبِ خدا کو اپنے جیسا بتاتا تھا جبکہ حضور اکرم ﷺ نے اپنے بارے میں یوں ارشاد فرمایا،'' کون ہے تم میں مجھ جیسا'' بظاہر یہ وہ مسلمان تھے جن کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے،'' شکل مومناں کرتوت کافراں'' یہ وہ پُر فتن دور تھا جس میں مسلمانوں کے دلوں سے عشق رسول ﷺ کی عظمت گھٹائی جارہی تھی۔محبوبِ خدا سے مدد واستعانت کو شرک وبدعت ٹھہرایا جارہا تھا۔خدا نے اپنے دین کی حفاظت کا ذمہ خود لیا ہے اور جب بھی دین پر حملہ ہوا وہ اپنے نیک بندوں کو دین کی حفاظت کیلئے اس خاکدانِ گیتی پر بھیجتا رہا ہے۔اس دورِ پُر فتن میں جب دینی بے راہ روی بڑھی تو اس کی رحمت کو جوش آیا اور ۱۸۵۶ء میں دین کی حفاظت کیلئے ایک عاشقِ رسول ﷺ کو پیدا فرمایا جسے دنیائے اسلام امام احمد رضا محدّث بریلوی کے نام سے جانتی ہے۔

امام احمد رضا المعروف اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ سو سے زائد علوم وفنون میں کامل دسترس رکھتے تھے۔ ہزار سے زائد تصنیفات لکھیں، دیگر علوم وفنون کے علاوہ شاگردوں کی تربیت کے ساتھ ساتھ تصوف میں بھی غیر معمولی کارنامہ انجام دیا،علم قرآن،اصول حدیث،علم حدیث،فقہ،تفسیر،منطق،ریاضی،ہندسہ، شاعری گویا جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق ادا کر دیا اسی لئے تو وہ کہتے ہیں

ملک سخن کی شاہی تم کو رضا مسلّم
جس سمت آ گئے ہو سکّے بٹھا دیئے ہیں

فن شعر وسخن میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں خود لکھا ہے'' جب سرکار کی یاد تڑپاتی ہے تو میں نعتیہ اشعار سے بے قرار دل کو تسکین دیتا ہوں ورنہ شعر وسخن میرا مذاق نہیں'' انھوں نے شاعری میں نہ ہی کسی سے شرف تلمذ اختیار کیا۔گویا وہ تلمذ الرحمٰن کی مکمل تفسیر تھے۔اسی لئے وہ کہتے ہیں'' غبارِ منت اصلاح سے ہے دامن دور'' اپنی شاعری میں انہوں نے دشمنانِ اسلام کے گندے عقائد کو پورے شد ومد کے ساتھ پیش کیا۔حُب رسول ﷺ کا ایک انداز یہ بھی ہے جو قابل داد ہے ملاحظہ فرمایئے۔

دشمن احمد پہ شدت کیجئے ملحدوں کی کیا مروت کیجئے
مثل فارس زلزلے ہوں نجد میں ذکر آیاتِ ولادت کیجئے
شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب ﷺ اس برے مذہب پہ لعنت کیجئے

غیظ میں جل جائیں بے دینوں کے دل　　یا رسول اللہ کی کثرت کیجئے
سورج الٹے پاؤں پلٹے، چاند اشارے سے ہو چاک　　اندھے نجدی دیکھ لے قدرت رسول اللہ کی
اور تم پر مرے آقا کی عنایت نہ سہی　　نجدیو کلمہ پڑھانے کا بھی احسان گیا

امام احمد رضا کی شاعری کا ماخذ قرآن کریم اور احادیث نبوی ہے۔ انہوں نے اس کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔

ہوں اپنے کلام سے نہایت محظوظ　　بے جا سے ہے المنتہ للہ محفوظ
قرآن سے میں نے نعت گوئی سیکھی　　یعنی رہے احکام شریعت ملحوظ

انہوں نے عقیدت اور جذبۂ محبت کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ آدابِ شرعیہ کے پس منظر میں شاعری کی۔ انہیں نعت کی فنّی باریکیوں کا پورا احساس تھا۔ اس لئے ایک جگہ وہ کہتے ہیں۔ ''حقیقت میں نعتِ شریف لکھنا نہایت مشکل ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے البتہ حمد آسان ہیکہ اس میں راستہ صاف ہے جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے غرض حمد میں ایک جانب اصلاً کوئی حد نہیں اور نعت شریف میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے۔'' امام احمد رضا کو بلاشبہ اپنی شاعری پر فخر نہیں تھا انہیں فخر تھا تو حضور کی مدح سرائی میں۔ کتنے خوبصورت انداز میں کہتے ہیں۔

کروں مدح اہل دول رضاؔ پڑے اس بلا میں مری بلا
میں گدا ہوں اپنے کریم کا مرا دین پارۂ ناں نہیں

وہ خود کہتے ہیں نعت کہنے میں میرا کوئی کمال نہیں ہے یہ عطائے نبوت ہے جو فیض ملا ہے وہ درِ مصطفےٰ سے ملا ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ میں صرف ایک فن میں کامل ہوں وہ فن ہے نقصان کا۔

کس منہ سے کہوں رشک عنادل ہوں میں　　شاعر ہوں فصیح بے مماثل ہوں میں
حقا کوئی صنعت نہیں آتی مجھ کو　　ہاں یہ ہیکہ نقصان میں کامل ہوں میں

انہیں کمال حاصل ہے تو صرف بے کمالی میں کتنے خوبصورت انداز میں کہتے ہیں۔

محصور جہاندانی و عالی میں ہے　　کیا شبہ رضا کی بے مثالی میں ہے
ہر شخص کو اک وصف میں ہوتا ہے کمال　　بندے کو کمال بے کمالی میں ہے

امام احمد رضا نے نعت کے اظہار میں شریعت کا مکمل احترام کرتے ہوئے اشعار کہے ہیں۔ ان کا فکری شعور، تخلیقی جذبے کے ساتھ ساتھ فنی خوبیوں کا حامل ہے۔ جو بہت سے شعراء کو نصیب نہیں ہوتا۔ سنگلاخ اور سخت زمین میں بھی ان کی جودتِ طبع نے وہ نازک خیالی پیدا کی ہے کہ اندازِ بیاں غیر معمولی ہو جاتا ہے۔ اس انداز میں سادگی اور پُر کاری ہے غالبؔ کہتے ہیں شاعری قافیہ پیمائی کا نام نہیں معنی آفرینی کا نام ہے۔ لیکن قافیہ پیمائی بھی شاعری میں آسان نہیں اس میں اچھے اچھوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں قافیہ پیمائی نہیں کی بلکہ معنی آفرینی کے وہ جوہر پیدا کیے جس پر اہل نظر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے عقیدت کے جذبوں میں کہیں بھی حد تجاوز سے باہر نہیں جاتے بلکہ انفرادی اور امتیازی شان ہر جگہ برقرار رہتی ہے۔ ان کی جودتِ طبع کی رنگینی ملاحظہ فرمایئے۔

وہ کمال حسن حضور ہے کہ گمانِ نقص جہاں نہیں
یہی پھول خار سے دور ہے یہی شمع ہے کہ دھواں نہیں

سرتا بقدم ہے تن سلطانِ زمن پھول
لب پھول، دہن پھول، ذقن پھول، بدن پھول

دل اپنا بھی شیدائی ہے اس ناخن پا کا
اتنا بھی مہ نو پہ نہ اے چرخ کہن پھول

ہے لب عیسیٰ سے جاں بخشی نرالی ہاتھ میں
سنگریزے پاتے ہیں شیریں مقالی ہاتھ میں

مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

پوچھتے کیا ہو، عرش پر یوں گئے مصطفےٰ کہ یوں
کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

جان ہے عشق مصطفےٰ روز فزوں کرے خدا
جس کو ہو درد کا مزا ناز دوا اٹھائے کیوں

حسن یوسف پہ کٹیں مصر میں انگشت زناں
سر کٹاتے ہیں ترے نام پہ مردانِ عرب

علامہ اقبال کے سامنے کسی نے اعلیٰ حضرت کا یہ شعر پڑھا۔

خدا کی رضا چاہتے ہیں دو عالم
خدا چاہتا ہے رضائے محمد ﷺ

تو اقبال متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے انہوں نے فی البدیہہ دو شعر کہے۔

تماشا تو دیکھو کہ دوزخ کی آتش
لگائے خدا اور بجھائے محمد ﷺ

تعجب تو یہ ہے کہ فردوس اعلیٰ
بنائے خدا اور بسائے محمد ﷺ

اکثر علماے کرام علامہ اقبال کا یہ حوالہ دیتے ہیں۔ وہ اپنے وقت کے امام ابوحنیفہ ہوتے اگر ان میں شدت نہ ہوتی (یہ شدت محض عشق رسول ﷺ کی وجہ سے تھی) جبکہ قرآن سورۂ مجادلہ میں فرماتا ہے۔ ''تم نہ پاؤ گے ان لوگوں کو جو یقین رکھتے ہیں اللہ اور پچھلے دن پر کہ دوستی کریں ان سے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے مخالفت کی اگر چہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا کنبے والے ہوں۔'' کچھ مسلمان جو کہتے پھرتے ہیں کہ ''مریض محبت نہ شیعہ نہ سنی'' ان کیلئے یہ آیت کسی تازیانے سے کم نہیں ہے۔ آیت مبارکہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بے دینوں اور بدمذہبوں اور گستاخوں سے میل ملاپ جائز نہیں چنانچہ حضرت ابوعُبیدہ رضی اللہ عنہ ابن جراح نے جنگ احد میں اپنے باپ کو قتل کیا اس وقت کچھ منافقین ایسے بھی تھے جو بظاہر مسلمان تھے قرآن نے ان کے بارے میں یہی کہا ''لا تعتذر و قد کفر تم بعد ایمانکم'' بہانے نہ بناؤ تم کافر ہو چکے، مسلمان ہو کر، اس پس منظر میں اقبال کا تاثر خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ جو انہوں نے اعلیٰ حضرت کے بارے میں فرمایا پتہ نہیں اقبال اعلیٰ حضرت کی تعریف کر رہے ہیں یا اعلیٰ حضرت کی شخصیت کو مجروح کر رہے ہیں۔ اس قسم کے حوالے سے سنّی علماء کرام کو بچنا چاہیئے۔ اعلیٰ حضرت کی شخصیت بغیر حوالوں کے بھی اعلیٰ حضرت ہے جو عاشق رسول بھی ہے اور عاشق صادق بھی، عظمت رسالت ﷺ پر حملہ ایک تاریخی تسلسل ہے جو حضور ﷺ کے زمانے سے لیکر آج تک موجود ہے۔

انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ یہی پیغام دیا ہے کہ اللہ اور رسول ﷺ کے دشمنوں سے دشمنی کئے بغیر صحیح اور سچی نعتیہ شاعری نہیں کر سکتے، توحید کی دعوت، شانِ رسالت ﷺ گھٹا کر نہیں دے سکتے۔ عبادت اور اطاعت کے نام پر محبت سے عاری مسلمانوں کیلئے ان کی شاعری کسی تازیانہ سے کم نہیں کیونکہ جس نے رسول ﷺ کا حکم مانا اس نے اللہ کا حکم مانا۔ حکم مانو اللہ کا حکم مانو رسول کا، قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ،اے مرے محبوب دنیا سے کہدو اگر خدا سے محبت کرتے ہو تو رسول ﷺ کے پیار میں ڈوب جاؤ۔ خدا کی محبت اسی عشق مصطفےٰ ﷺ میں ملیگی۔

شیخ ابن تیمیہ جیسا آدمی بھی قبر انور کی زیارت کو بدعت سمجھتا ہے یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ حضور ﷺ کی مدح وثناء اور نعت کا اہتمام کرنا خود دین کو قائم کرنا ہے اور اسے ضائع کر دینا سرے سے دین ہی کو ضائع کرنا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے اپنی شاعری کے ذریعے دین کو قائم کیا شریعت کی حفاظت عقیدہ اور عمل کیساتھ سنت مصطفےٰ کے سانچے میں ڈھال کر کی۔ جس کا اظہار ان کی زندگی کے ہر پہلو سے، چاہے

خلوت، چاہے جلوت ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے میں اپنے مضمون کو ان کی رباعی پر ختم کرنا چاہتا ہوں آپ بھی مرحبا اور صل علیٰ کہئے کتنی پیاری رباعی ہے۔

اللہ کی سرتابقدم شان ہیں یہ ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں ایمان یہ کہتا ہے مری جان ہیں یہ

سبحان اللہ کیا رباعی ہے مضطرب روح کی تسکین کا اظہار داخلی نور کے ساتھ در آیا ہے۔ جس میں سوز ہے گداز ہے، کسک ہے تڑپ ہے جو ایک عاشق صادق کی کیفیت کا مکمل اظہار ہے۔ ان کی شاعری اسلامی روح اور شریعت کے عین مطابق ہے۔ بقول اوشا سانیال ''بیسویں صدی کے اختتام تک لوگوں کا نظریہ اعلیٰ حضرت کی نسبت مثبت ہو جائے گا وہ صحیح تناظر میں دیکھنے کو مجبور ہوں گے۔'' اور ہم دیکھ رہے ہیں اکیسویں صدی میں اعلیٰ حضرت کو کھلے ذہن سے مطالعہ کرنے والے حضرات ان کے علمی مرتبہ کو ماننے یعنی ''رتبۂ خاص'' کو ماننے اور جاننے لگے ہیں جس کا ثبوت یہ ہیکہ ان کے مخالفین نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعے ان کی علمیت کو تسلیم کیا ہے اور سارا عالم ان کے علمی و دینی افکار سے اکتساب فیض کر رہا ہے تحقیقی سطح پر ہونے والے کاموں سے ان کے علم و فن کی کرنیں مزید تابناک ہو رہی ہیں جو مہر منیر کی طرح درخشاں و تابندہ ہیں اسی لئے دنیائے سلام انہیں مجدد و مصلح ماننے پر مجبور ہے۔ پروفیسر عبد الرحمٰن بخاری (پاکستان) لکھتے ہیں۔۔۔۔ میں انہیں فہم دین میں حجت گردانتا ہوں۔ اور صرف اس لئے گردانتا ہوں کہ امام احمد رضا نے فہم دین کی اساس عشق مصطفےٰ پر اُٹھائی ہے۔

اے عصائے موسوی در عصر ما

(بلاشبہ آپ کی ذات گرامی عصر حاضر میں عصائے موسوی ہے۔)

■■■

ادیبؔ اور روایت

ادیب الملک حضرت ادیبؔ مالیگانوی

(آمد ۱۹۰۹ء ------- رخصت : ۱۳ رمئی ۱۹۸۷ء)

غزل قصیدۂ فصل بہار ہے اب بھی
کہ اس میں حسن چمن جاگتا لگے ہے مجھے

ادیبؔ مالیگانوی

مقیم اثر بیاولی نے ادیب الملک حضرت ادیب مالیگانوی کا نقشہ یوں کھینچا ہے۔

"---- یہ شخص کون ہے جو نورانی مسجد کے دلکش، مقدّس پُرنور، منقّش، بلند میناروں کے ساتھ سورج کی شعاعوں کی طرح نیاپورہ کی ایک باریک گلی سے طلوع وغروب کی منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔ لباس سادہ میں اپنی شخصیت کی پُرکاری چھپائے گلی کوچوں کو اپنے راز اگلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی بھکّو چوک میں احباب کے ساتھ کُرسیوں کی زینت بنا ہوا، کبھی ڈاکٹر نایاب کے ساتھ فتح میدان کے کسی ہوٹل کی دو کرسیاں سنبھالے باہم سرگوشیوں میں مصروف ہے۔ جہاں احباب مل گئے وہیں بیٹھ گئے۔ کبھی عالموں کے ساتھ کبھی قلمکاروں کے ساتھ تو کبھی زندگی کے گھسے پٹّے پُرزوں کے ساتھ کوئی منچ ایسا نہیں جہاں یہ ذاتِ گرامی دکھائی نہ دیتی ہو۔ گاؤں کے کسی ذمہ دار، کسی غم گسار قوم، کسی رہنمائے قوم کی موت واقع ہوئی حضرت ادیبؔ کے اشک مرثیہ میں ڈھل گئے کیسی مرنجان مرنج شخصیت ہے۔ قد درمیانہ، چہرہ فقیرانہ، ادا شاہانہ، سینہ حالات کی نامساعدت کی وجہ سے تنگ مگر حوصلہ فراخ، گندمی رنگ میں سیاہی مائل ملاحت اپنا نقشہ جمائے ہوئے آنکھیں جلالی سرخ قدرے ابھری ہوئی جیسے کہ خاروں پر کسی نے دو سرخ پیالے الٹ کر رکھ دیئے ہوں۔ ناک شمشیر کی باڑھ کی طرح لانبی، نکیلی، تیز دھاری، پیشانی نہایت کشادہ، جبیں کی شکنوں کا جمال ذہانت اور زندگی کے گہرے تجربوں کا کھلا اور واضح نشان مضبوط زور لانبے ہاتھوں والا یہ شخص زمین پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑتا چلتا ہوش کی مضبوط زبان

سے مسائل کی گرہ کشائی کرتا کبھی چپ نہیں رہتا خاموش نہیں بیٹھتا کون جانے اسے سکون سے اتنی دشمنی کیوں ہے"۔۔۔۔ جسے میں درزبانِ اقبال یوں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

موجِ زخود رفتئی تیز خرامید و گفت
ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

کانوں کی لمبائی سے فائدہ اٹھاتا ہے چپ چاپ ساری باتیں سن لیتا ہے موٹے موٹے ہونٹ مشاعروں میں باہم گفتگو میں کبھی سنگ کبھی پھول برساتے رہتے ہیں بے نیاز عدم وجود اپنی رو میں مست زیست کی تاریک رہگزر کو اپنی مشعل فکر سے منور کیے ہوئے۔۔۔۔۔مشاعروں میں نہایت تزک واحتشام کے ساتھ شرکت فرماتے بدن پر شیروانی سر پر جناح کیپ ایک چادر کبھی ہاتھ کے اوپر گھڑی کر کے رکھی ہوئی، کبھی شیروانی کے اوپر کسی فوجی جنرل کی طرح بازوؤں سے گذرتی ہوئی دونوں شانوں کے پیچھے محبوب کی زلف کیطرح لٹکی ہوئی۔ پورا مجسمہ ڈاکٹر بشیر بدر کے شعر کی نفی کرتا ہوا۔

سر سے چادر بدن سے قبا لے گئی　　زندگی ہم فقیروں سے کیا لے گئی

ہندو پاک کے معتبر افسانہ نگار، سلطان سبحانی نے ادیب صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

یہ تذکرہ اس شاعر کا ہے جس نے اپنی کتاب "تبسّم" کا مقدمہ خود لکھا جو بظاہر ایک مصرعے کا ہے لیکن اردو ادب کا سب سے بڑا مقدمہ ہے میری دانست میں اردو کا اتنا زبردست اور پر اعتماد مقدمہ کسی نے نہیں لکھا ہے۔

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

فن کار کا رُجحان جب خارجیت کی طرف ہوتا ہے تو دل کی دنیا سے دور ہو جاتا ہے اسی لئے غزل کو داخلی شاعری کی آواز کہا گیا ہے جسمیں لفظوں کا رشتہ جذبہ واحساس کے ساتھ اسطرح جڑا ہوتا ہے کہ شعر کا اثر معنی سے پہلے ہمارے دل ودماغ کو متاثر کرتا ہے ہر انسان یا فنکار، کسی نہ کسی شعبے میں تخلیقی قوتوں کا مظہر ہے جسمیں وہ اپنے اظہار کو فکری میلانات کے درمیان ایک جمالیاتی توازن کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتا ہے اور زندگی کے نمو کے رنگ باریک بینی سے لطیف جذبوں میں سمیٹ کر اظہار کی نئی راہیں ہموار کرتا ہے۔

واقعی واقعی نہیں لگتی دل لگی دل لگی نہیں لگتی
بات ہنسنے کی ہوکہ رونے کی سب کے منہ سے بھلی نہیں لگتی

ادیبؔ

زندہ شاعری میں ہر زمانے کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور دھڑکنوں کی یہ آواز ادیب صاحب کی شاعری میں بہت تیز ہے یہی وجہ ہے کہ احسان بن دانش، احتشام حسین، آل احمد سرور اور احمد جعفری جیسے ناقدین نے ان کو اس نگاہ سے دیکھا جسطرح ہم اور آپ اگلوں کو دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کلاسک کی تکمیل ادیب کے کلام میں مکمل طور سے ملتی ہے۔

لطف زبان کے ساتھ ادیبؔ کی غزلوں میں ماورائی نرمی بھی ہے جسمیں شوخی وطنز کے ساتھ ایک ادبی چنگاری کا احساس ہوتا ہے جو شعر کے دامن کی ہوا سے بھڑک اٹھتی ہے ادیبؔ کے اشعار زیادہ اس لئے پیش کروں گا کہ بہت سے پڑھنے والوں کو ممکن ہے شروع سے آخر تک ان کا کلام پڑھنے کا موقع نہ ملے۔ اس لئے میں نے انتخاب میں زیادہ سے زیادہ اشعار لئے تا کہ جامع ومبسوط اندازِ سخن کے اشعار کا نقشہ پیش کرسکوں۔

جوانی ہمیں بھول جائے گی لیکن
بھلانے کے قابل جوانی نہیں ہے

ادیبؔ

ادیبؔ کا جب بھی یہ شعر مجھے یاد آتا ہے تو اسی قبیل کا ایک شعر حالیؔ کا بھی یاد آنے لگتا ہے۔

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت

حالیؔ

دونوں اشعار کا اگر موازنہ کیا جائے تو حالیؔ کے شعر میں پھیکے پن کا احساس ہوتا ہے ویسے حالیؔ کا شعر اتنا بُرا بھی نہیں لیکن جو ٹیس جلن، نرمی اور سوز وگداز ادیبؔ کے شعر میں ہے وہ حالیؔ کے شعر میں نہیں ہے۔ ادیبؔ کے کلام کا انتخاب میرؔ، غالبؔ، حالیؔ، ذوقؔ اور فراقؔ کے کلام کے ساتھ رکھا جاسکتا ہے۔ ادیبؔ کے اشعار میں ہمیں سادگی، روانی، برجستگی اسی طرح ملتی ہے جس طرح اسلاف کے اشعار

میں ۔۔۔۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ ادیبؔ کی شاعری کلاسیکی زبان وادب کی بنیاد پر کھڑی ہے۔ انہوں نے کسی کا اتباع نہیں کیا بلکہ توازن کے ساتھ فکری جہت کی طرف پیش قدمی کرنے میں کامیابی حاصل کی۔ آیئے پہلے کچھ اشعار اسلاف کے پیش کروں۔

مفلسی سب بہار کھوتی ہے ۔۔۔ مرد کا اعتبار کھوتی ہے
مسندِ گُل منزلِ شبنم ہوئی ۔۔۔ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
جسے عشق کا تیر کاری لگے ۔۔۔ اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے

(ولیؔ دکنی)

زندگی دردِ سر ہوئی حاتم ۔۔۔ کب ملے گا مجھے پیا میرا

(حاتمؔ)

مصائب اور تھے پر دل کا جانا ۔۔۔ عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے
بال و پر بھی گئے بہار کے ساتھ ۔۔۔ اب توقع نہیں رہائی کی

(میرؔ)

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو ۔۔۔ یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

(مرزا مظہر جانِ جاناں)

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۔۔۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے
آہی جاتا وہ راہ پہ غالبؔ ۔۔۔ کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

(غالبؔ)

بیوفائی پہ اس کی دل مت جا ۔۔۔ ایسی باتیں ہزار ہوتی ہیں
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے ۔۔۔ ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(دردؔ)

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے ۔۔۔ تم نے اچھا کیا نبھاہ نہ کی
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ۔۔۔ ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

(مومنؔ)

دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل　　اگر تیر اس کا خطا ہو گیا
(حالؔی)

نخوت سے جو کوئی پیش آیا　　کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی
(مصحفؔی)

عہدِ پیری شباب کی باتیں　　ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں
(ذوقؔ)

مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا پر　　ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا
زمانے کے ہاتھوں سے چارا نہیں ہے　　زمانہ ہمارا تمہارا نہیں ہے
(عبرت گورکھپوری)

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا　　بات پہنچی تری جوانی تک
(فانؔی)

اس دور میں زندگی بشر کی　　بیمار کی رات ہو گئی ہے
ہم سے کیا ہوسکا محبت میں　　تم نے تو خیر بیوفائی کی
(فراقؔ)

دل گیا رونقِ حیات گئی　　غم گیا ساری کائنات گئی
(جگرؔ)

جانے والے کبھی نہیں آتے　　جانے والوں کی یاد آتی ہے
(وجدؔ)

کٹ گئی احتیاطِ عشق میں عمر　　ہم سے اظہار مدعا نہ ہوا
(حسرتؔ)

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی　　شکر ہے زندگی تباہ نہ کی
(فیضؔ)

ان اشعار کی سادگی میں جتنا شعور چھپا ہوا ہے وہ ہم پر عیاں ہے سادگی کے معنی ہم اور آپ جو سمجھتے ہیں وہ نہیں ہے بلکہ سادگی میں احساس وجذبہ کے ساتھ شعور کا حسن بھی رچا ہوا ملتا ہے جس میں سادگی و پُرکاری کا راز پنہاں ہے سہلِ ممتنع کی خوبی یہ نہیں کہ شعر صرف سادہ ہو بلکہ سادگی ورنگ میں لہجے کی گرمی، انداز کی بے ساختگی جسے غالبؔ نے ''دلِ گداختہ'' سے تعبیر کیا ہے اور میرؔ نے اسے ''سلیقہ شرط ہے ہر اک امر میں'' کہا ہے شعور اور لاشعور سے ادیبؔ کی شاعری کا رنگ اُبھرتا ہے۔ جسمیں تنوع ہے اظہار کی بھرپور قوت وتوانائی کے ساتھ اُجاگر ہے طبع کی روانی بیشتر شاعروں کو لے ڈوبتی ہے کیونکہ اس سے اشعار میں ایجاز وارتکاز دونوں مفقود ہو جاتے ہیں۔ صرف موزونی طبع کی روانی سے جگر سوزی والا فن نہیں ملتا بقول فراقؔ۔۔۔۔

دوستو صرف طبع موزوں سے دولتِ شاعری نہیں ملتی

(فراقؔ)

آیئے ادیبؔ کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جن میں نہایت سادگی سے معنی کی تہیں اور احساس وجذبہ کی گہرائی چھپی ہوئی ہے اس طرز کو ان کے اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے بظاہر شعر آسان اور سادہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس رنگ سخن میں شاعری کرنا آسان نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔

چشم ظاہر کا بند ہونا تھا
کھل گئیں جیسے بے شمار آنکھیں

تم نے جفا سے یوں ہاتھ اٹھایا
گویا مجھے اب جینا نہیں ہے

حسن اور اتنا بے درد یارب
ایسا نہیں ہے ایسا نہیں ہے

قسمت اسی کو کہتے ہیں شاید
جو چاہتے ہیں ہوتا نہیں ہے

پھولوں کو زنجیر میں دیکھا
باغوں کی رنگین فضا نے

پانی پانی مل جاتا ہے
موجوں کا ٹکرانا کیا

نازوں کا پالا حسرت کا مارا
اک دل تمہارا، اک دل ہمارا

دل کا سفینہ ایسا سفینہ
گرداب طوفاں، جس کا سہارا

رکھ کے سر ترے آستانے پر
عشق ہنستا رہا زمانے پر

اڑ گئے ہوش سامنے ان کے
دُور پہنچے قریب جانے پر

زندگی آنسوؤں کی نذر ہوئی
جو گیا ان کے مسکرانے پر

بجلیاں ہیں کہ میرا حسن خیال
کچھ اجالا ہے آشیانے پر

تو محبت کو آزما تو سہی
جان دے دیں ترے اشاروں پر

مذاق غم دل نہیں ہر کسی میں
بڑا فرق ہے آدمی ، آدمی میں

غزل جو کسی زمانے میں خارجی پہلوؤں کی دلدادہ تھی اور صرف حسن و عشق کی رنگینیاں ناز و ادا ، جمال و جلال جنس و جسم تک محدود تھی۔ آج کی غزل حیات و کائنات کا شعور رکھتی ہے عشقیہ کیفیات کے پس منظر میں اس کے کئی عکس رنگ بکھرتے دکھائی دیتے ہیں اس لئے غزل کے جو مروجہ معنی ہم لیتے ہیں اب وہ نہیں ہے غزل اب ایک ہمہ گیر وسعت کے ساتھ سفر کر رہی ہے زندگی اب کائنات کا جزو نہیں بلکہ کائنات کا حسن بن کر نمودار ہو رہی ہے ادیب کی شاعری زندگی کی آئینہ دار ہے وہ زندگی سے بے زار نہیں ہے وہ زندگی کے تمام دکھ درد کو جھیل کر بھی خوش رہے اس لئے انہیں ''شاعر حیات'' کہا گیا ہے ان کی شاعری میں حیات کے تعلق سے جذبہ و احساس کا ایک واضح شعور ملتا ہے بقول شخصے

''۔۔۔۔ادیب مالیگانوی کی شاعری کا ہر گوشہ زندگی کا ترجمان ہے ''تبسم'' کی ہر غزل میں زندگی کا حسن ہے آپ نے سماجی نظموں اور تقریباتی نظموں میں زندگی کے صحیح حالات کی عکاسیاں کی ہیں۔ جہاں ان کے یہاں عشقیہ کیفیات کا اظہار ملتا ہے وہیں ہمیں زندگی سے والہانہ عشق کا بھی اظہار ملتا ہے جسمیں لطف و انبساط کی کیفیت، سوز و گداز کے ساتھ کارفرما ہے۔۔۔۔۔''

زندگی سوز محبت سے سنورتی ہے ادیبؔ
غم سلامت ہے تو مٹی مری برباد نہیں

تم نے برباد کیا بھی تو اس احسان کے ساتھ
جیسے مدت سے مجھے شوق تھا مٹ جانے کا

رونق کون و مکاں تم ہو سنا تھا میں نے
ایک اجڑا ہوا دل تم سے بسایا نہ گیا

تبسم ہو جسمیں نئی زندگی کا
وہ آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے

ترا ستم ہو یا بے نیازی
یہ بھی گوارا ، وہ بھی گوارا

مرا مزاج ہمیشہ سے ہے حجاب پسند
کرم بھی وہ جو کرے تو سزا لگے ہے مجھے

اضطراب آرزو کو زندگی کہتا ہوں میں
زندگی کیا؟ اضطراب آرزو جب کم ہوا

احساس عمل کی چنگاری جس دل میں فروزاں ہوتی ہے
اس لب کا تبسم ہیرا ہے اس آنکھ کا آنسو موتی ہے

دیکھ رہی ہے چشم زمانہ یہ منظر حیرانی سے
سورج کا دل کانپ رہا ہے ذرّوں کی تابانی سے

سکندر لوٹ کر بھی خوش نہیں دولت زمانے کی
لٹا کر مایۂ ہستی قلندر رقص کرتا ہے

ادیبؔ کی عشقیہ شاعری نہ تو جوانی کے خمار کا نشہ ہے اور نہ ہی طبیعت کا ایک غبار بلکہ ایک سچے عاشق کی سچی ترجمانی ہے ان کے یہاں عشقیہ اشعار میں والہانہ سرمستی کے ساتھ درد وغم کی ایک جھلک بھی ملتی ہے جسمیں سرمستی کے ساتھ ساتھ درد ونشاط آمیز کیفیات کا عکس ہے کہنے کو ادیبؔ ایک دیہاتی ہے لیکن اس کے فن میں جو سوز وگداز ہے اسے اک زمانے تک صرف دلّی اسکول کی شاعری کا طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا اس امتیاز کو ادیبؔ کی شاعری نے آئینہ دکھانے کی سعی فرمائی ہے۔

یہ رنگ سخن یہ حسن بیاں کم ہونگے ادیبؔ ایسے شاعر
ممتاز ہے یہ شہروں شہروں کہنے کو تو اک دیہاتی ہے

آیا نہ اس کو کاغذی پھولوں سے کھیلنا
خونِ جگر کے نام سے کرتا ہے شاعری

مدیر بیباک ہارون بی اے نے ایک مشاعرہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

۱۹۵۸ء میں ایک عظیم الشان مشاعرہ محمد علی روڈ پہ زیر صدارت مولانا عبدالحمید نعمانیؒ منعقد ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ مالیگاؤں کی تمام ادبی وشعری انجمنوں کو ایک پلیٹ فارم پر ہارون بی اے صاحب نے اکٹھا کردیا۔ بیرونی شعراء میں محمود درّانی، رامش پرتاپگڈھی، زیب اللہ زیب، شکیب بنارسی، پروازاعظمی اور سلامت خیرآبادی بھی حاضر تھے۔ دس ہزار کے مجمع میں جس وقت حضرت ادیب نے اس غزل کو چھیڑا اسٹیج پر ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ادیبؔ صاحب کے وہ تمام معاصرین جن سے اکثر نوک جھونک چلتی رہتی تھی انہوں نے اس غزل کو رنگِ تغزل سے خارج قرار دینے کی کوشش کی اور حضرت کو پڑھنے سے روکے رکھا۔ پورا مجمع باآواز بلند حضرت کے حق میں اصرار کررہا تھا کہ وہ غزل پڑھیں۔ حضرت نے اپنے دلکش ترنم سے دوبارہ غزل چھیڑی اور مجمع لہک لہک کر داد دے رہا تھا۔ مخالفین دب گئے اور حضرت مشاعرہ کے ہیرو کہلائے۔ آیئے وہ غزل بھی پڑھیے جس نے ہنگامہ برپا کردیا تھا۔

اہل ستم کے گھیرے میں عشق جہاں گھر جاتا تھا
پھول سمجھ کر شعلوں کو دامن میں چُن لاتا تھا

مجھ سے میرے نام سے ضد کوئی انوکھی بات نہیں
دھوپ سے سایہ اپنی جگہ پہلے بھی گھبراتا تھا

توڑو گے پیمانِ وفا، رکھ کر کچھ الزام نئے
رنگ تمہاری چتون کا کل بھی یہی سمجھاتا تھا

غیروں سے سرگوشی تھی، ذکر تھا جانے کیا لیکن
میری طرف بھی مڑ مڑ کر ظالم ہنستا جاتا تھا

دیکھ سر محفل ان کی شوخ نگاہی کا عالم
پردۂ در کی جنبش سے جن کو پسینہ آتا تھا

فتنۂ عقل وعلم و ہنر، پیکر نخوت میں ڈھل کر
اب بھی تباہی لاتا ہے، جب بھی تباہی لاتا تھا

ہوں تو بھرے گلشن میں مگر ویرانے کا پھول ہوں میں
گرم ہوا کے جھونکوں میں کل بھی یوں ہی لہراتا تھا

سی کر اس کے ہونٹوں کو کل بھی ہوئی تھی دنیا شاد
جس کے ساز کا ہر نغمہ، روح چمن بن جاتا تھا

ذہن پہ اہل ساحل کے نقش تو ہوگا وہ منظر
اک تنکا طوفانوں سے جب تنہا ٹکراتا تھا

گرد اڑا کر دنیا نے پہلے بھی کیا چھین لیا
دل موتی برساتا ہے، دل موتی برساتا تھا

نور سحر کے ہنگامے اس کو پریشان کیوں نہ کریں
خوابوں کی تاریکی میں جو دل تسکیں پاتا تھا

یہ غل یہ ہنگامہ کیوں؟ پیارے کوئی بات بھی ہو
اب بھی ہوا سے لڑتا ہے، کل بھی یوں ہی برآتا تھا

اچھائی اور بد نامی غالبؔ کا حصہ ہے ادیبؔ
میں بھی یہی کہلاتا ہوں، وہ بھی یہی کہلاتا تھا

حوالہ ''بیباک'' کا ادیب نمبر، جلد نمبر ۱۹، شمارہ نمبر ۲۶، ۲۶ر جون ۱۹۸۷ء

دلّی اپنے تاریخی عہد میں علم وفن کا بڑا مرکز بنی ہوئی تھی اردو زبان نے وہاں اپنی نوک پلک سنواری تھی۔ میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ وظفرؔ نے اردو شاعری کے ذریعے داخلی اور خارجی کیفیات کے زیر اثر سوز وگداز کے ماحول کو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ کیا تھا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ یہ لطیف کیفیات کا کارنامہ ان کا ہی حصہ تھا جنہوں نے شعری زبان کو سوز وگداز کی ادا دی تھی اس کے بعد لکھنؤ نے اس کو اور گہرا رنگ دیا ان دو بڑے مراکز کے بعد یہ رنگ طبیعت ایک صدی کی دھوپ کھاتے ہوئے آگے بڑھا بیسویں صدی میں ادیبؔ نے اس امتیاز کو اپنا کر اپنے ہم عصروں میں دھوم مچائی اور قارئین و ناقدین کو بہت متاثر کیا ہے۔

ترے حسن کا یہ کمال ہے کہ فریب بھی ہے کھلا ہوا
مرے عشق کی ہے یہ سادگی کہ کھلا فریب بھی نہ کھا سکے

اس چمن میں کبھی ایسی بھی فضا ملتی ہے
پھول ہنستے ہیں تو ہنسنے کی سزا ملتی ہے

کر دیا مصلحت وقت نے اتنا محتاط
لالہ و گل سے دبے پاؤں صبا ملتی ہے

درد مندانِ محبت سے یہ کہہ دے کوئی
کوئے قاتل سے گذر گاہِ وفا ملتی ہے

کس قدر شوخ ہوا، خونِ تمنا میرا
اب تو اس سے تیرے ہاتھوں کی حنا ملتی ہے

نیند اڑ جائے نہ کیوں اہلِ سفینہ کی ادیبؔ
موج جو اٹھتی ہے طوفان سے جا ملتی ہے

اپنا تو ایمان یہی ہے ہو لے جو کچھ ہونا ہے
غیر کے ہیرے کنکر پتھر اپنی مٹی سونا ہے

روند کے نازک پھولوں کو ہنس لینا ہے آسان مگر
اپنی راہِ عمل میں یارو خود ہی کانٹے بونا ہے

محفل محفل چھائے ہوئے ہیں کہنے کو ارباب نظر
جو آنکھیں تھیں شمع بصیرت ان آنکھوں کا رونا ہے

کوئی کوئی شاخ نشیمن پہلے جل جاتی تھی ادیبؔ
برق ستم کی زد میں اب تو باغ کا کونا کونا ہے

زندگی جن کی عنایت سے برباد ہوئی
ان سے بھی کہہ نہ سکے حال پریشاں اپنا

پھول تو پھول ہیں کانٹوں سے بھی محبت کی ہے
اس چمن میں ہے یہی کار نمایاں اپنا

نظروں سے گذر جاتے ہیں ہستی کے کئی رنگ
آتا ہے جو سوکھا ہوا تنکا مرے آگے

داغِ دل بیدار سے اڑنے لگی خوشبو
پھول اس نے بصد ناز جو پھینکا مرے آگے

وہی سلوک مرے دل سے تم بھی کیوں نہ کرو
چمن کے ساتھ جو فصل بہار کرتی ہے

شاید یہی ہے اپنے لئے حاصلِ حیات
کھائیں وفا کے نام پہ دھوکا تمام عمر

دل پر بس ایک بار برس جائے ابر غم
پھر سوکھتا نہیں ہے یہ چشمہ تمام عمر

کیسے کیسے شیشہ گروں کی دھول اڑی گمنامی میں
تیشہ دروں کے نام کا سکّہ لیکن اب بھی جاری ہے

یہ بات ازل سے شامل ہے ہر اہلِ وفا کی فطرت میں
شعلوں میں بھی راحت ملتی ہے کانٹوں پہ بھی نیند آجاتی ہے

ادیب مالیگانوی بظاہر داخلی شاعری کے رخ پر ابھرتے ہوئے محسوس ضرور ہوتے ہیں مگر ان کے یہاں خارجی ماحول کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔ ان کی فکری لے خالص اسلامی تھی اور خارجی شاعری کا رویہ بظاہر ترقی پسندانہ تھا۔ وہ تحریکی مزاج نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کے خارجی عوامل میں وہ ذہن ونظر کی آزادی کو اولیت دیتے تھے اور سردار جعفری کو کوئی سرکاری اعزاز یا ایوارڈ ملا تھا اُس وقت ادیبؔ صاحب نے سردار جعفری کو مخاطب کر کے یہ شعر اُن کے سامنے پڑھا تھا۔

ذہن و نظر کی آزادی سے ہم تو ہوئے بدنام ادیبؔ
ان کی ناک ہے سب سے اونچی جن کا ادب سرکاری ہے

حضرتِ ادیبؔ کی غزل سُن کر علی سردار جعفری نے یوں ارشاد فرمایا کہ اساتذہ ایسی ہی غزلیں کہا کرتے ہیں۔ ادب اور شاعری پر وہ کسی جبری فکر ونظریئے کی چھاپ کو فنی اظہار کے حق میں سم قاتل سمجھتے تھے۔ حق گوئی و بیباکی ان کی فکر کا روشن رخ ہے۔ ان کی خارجی شاعری کی پوری کیفیات کا اگر جائزہ لیا جائے گا تو اوپر کی باتوں کی مکمل تصدیق ہو جائے گی۔ ان کے چند اشعار جو خارجی کیفیتوں سے لبریز ہیں

حوالے کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

ہم اہلِ جنوں اپنے عقائد میں عجب ہیں
حلقے میں صلیبوں کے بھی آسودۂ لب ہیں

آزادی حیات کی کیا بات کیجئے
آواز بھی فضا میں گرفتار ہو گئی

جہل الفاظ کی چلمن سے بھی چھن جاتا ہے
لوگ باتیں تو بناتے ہیں ارسطو کی طرح

اہل، گفتار ابھرنے نہیں دیتے ان کو
کچھ اگر صاحب کردار نظر آتے ہیں

وہ قدم چوم لو اٹھے جو صداقت کے لئے
ورنہ باطل کی طرف سے بھی لڑے ہیں کچھ لوگ

جب کبھی عزم غلط لے کے اُٹھا ہے کوئی
بیٹھ جاتا ہے وہ ساون کے بتاشوں کی طرح

رنگ جب فرض کو احسان کا دیتا ہے کوئی
زہر بن جاتے ہیں ''سونے کے نوالے'' کتنے

پھول پھول کا دشمن ،خار خار میں ان بن
باغ کی فضاوں سے لوگ تنگ آئے ہیں

پا گیا کچھ کہیں سے جو بندہ
اپنی حد میں خدا ہوگیا

بندوں نے خدائی تو خدا کی نہیں دیکھی
بندوں کی خدائی کو خدا دیکھ رہا ہے

ہوئے ہیں جب بھی سفید وسیاہ صف آرا
کہیں سپر کہیں تلوار بن گئے ہم لوگ

عظمت دنیا نہیں ہر آدمی کے واسطے
سر ہوا کرتے ہیں تاجِ خسروی کے واسطے

قطرہ شبنم لٹائے بھی تو آخر کیا لٹائے
ظرف بھی درکار ہے دریا دلی کے واسطے

اس آدمی کو فرشتوں میں جا کے چھوڑ آؤ
جس آدمی کو محبت نہ ہو زمیں کے ساتھ

سوامی کا اپدیش سُنا ہے واعظ کی تقریر سُنی
دل لگتی اک بات نہیں سب رنگ برنگی گھاتیں ہیں

جشن منائے جولاشوں پر، کیسی وہ تہذیبِ حیات
ہم کو ادیبؔ انکار نہیں ہے کشمکش انسانی سے

یوں تو دنیا میں سکندر ہیں ہزاروں لیکن
آئینہ سب کے مقدر میں کہاں ہوتا ہے

یہ ادا کرتی ہے خود رحمتِ باری پیدا
روز ہوتے نہیں دنیا میں بخاری پیدا

سوز فطرت کہیں کاغذ پہ اُتر سکتا ہے
میرا دل دیکھنے والے مری تصویر نہ دیکھ

ادیبؔ افکار کو سعی وعمل میں ڈھالنا ہو گا
دعاؤں سے مسائل زندگی کے حل نہیں ہوتے

بقول عبدالمجید سرورؔ: اردو غزل میں دار و رسن کے قصّے اتنی بار دوہرائے گئے ہیں کہ ان میں ندرت باقی نہیں رہی ہے فیضؔ نے البتہ ایک نکتہ پیدا کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے'' لیکن ادیبؔ صاحب کے یہاں دار و رسن کی حکایت بھی سُنتے چلئے۔ میرا دعویٰ ہے کہ پوری اردو شاعری میں اس طرح دار و رسن کو نہ باندھا گیا ہے نہ اس سے یہ مفہوم نکالا گیا ہے وہ کہتے ہیں،

منصب دار و رسن ہی نہیں شایانِ جنوں
زندگی کیلئے زندہ بھی گڑے ہیں کچھ لوگ

عبدالمجید سرورؔ مزید لکھتے ہیں جدید شاعری کے ضمن میں جواز میں ان کی غزل شائع ہوئی جو عصری تقاضوں اور اپنی تہہ دار معنی آفرینی کے لئے ہمیشہ باقی رہ جائے گی۔ چند اشعار بلا تمہید کے سنئے۔ علامتوں کے سہارے مضمون بندی کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ اشعار

گداز دل، خنک اعصابیوں سے کیا کہتا
یہ ذکر دار تھا محرابیوں سے کیا کہتا

شکایتیں تو رہیں مجھ کو، چاند سورج سے
میں جگنوؤں کی تنک تابیوں سے کیا کہتا

صنم پرست ہوئے بت شکن یہاں آکر
عجم کا حادثہ اعرابیوں سے کیا کہتا

مرا دماغ درخشاں تھا فکر رومی سے
میں اپنے دور کے فارابیوں سے کیا کہتا

مرا وجود تھا اک ریگزار کے مانند
ترے جمال کی شادابیوں سے کیا کہتا

بقول احمد نسیم مینانگریؔ: حضرت ادیبؔ نے خود کو منوانے کیلئے کوئی ایسا راستہ اختیار نہیں کیا جو ان کے مزاج اور ذہن کے منافی ہو۔ ان کا خیال تھا کہ فن بوئے گل ہے بوئے گل پھیلنے پر مجبور ہے اور بوئے گل سے انکار ناممکن ہے۔

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی عصری حسیّت سے بیگانہ نہیں تھے۔ وہ جوشؔ، فیضؔ، ساحرؔ، مجروحؔ کی طرح اپنے خارجی حالات کے اثرات کو اپنی شاعری کا جز ضرور بناتے تھے مگر ان کا فکری رویہ ان کو تقلید کی فضاؤں سے دور رکھتا تھا۔ ان کی شاعری ایک بچّے کی طرح سچائیوں کو برتتی اور

فطری اظہار کی حدوں میں رکھتی رہی۔ یہی وجہ ہے ان کی فکری توانائی خارجی پہلوؤں میں شاعرانہ بصیرت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ ادیبؔ ایک مکمل شاعر تھے ان کی شاعری زندگی کے تمام گوشون سے ہم آہنگ ہے مگر ان گوشوں پر ابھی تک تنقیدی کام نہیں ہوا ہے چنانچہ ایک مشہور شاعر ہونے کے باوجود ان کو وہ مقام نہیں ملا جو ملنا چاہیئے تھا۔

ادیبؔ انکار کی جرأت ہے کس کو اس حقیقت سے
تیری شہرت سے تابندہ وطن کا نام دیکھا ہے

میں حضرت ادیب کو اس شعر کے ساتھ خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

تری بھی حسن کاری کے ہزاروں لوگ ہیں قائل
گلی کوچوں سے لیکن اس کا جادو بھی نہیں نکلا

اقبال ساجد (پاکستان)

■ ■ ■

جمالیاتی اقدار کا شاعر

سکندر علی وجدؔ

(آمد : ۱۹۱۳ء ------- رخصت : ۱۶ر مئی ۱۹۸۳ء)

میر ممتاز علی، میر فیض علی، عبدالرحیم، عبدالرشید، سکندر علی وجدؔ صاحب کے چار بھائی تھے اور بہنیں تین تھیں۔ وجدؔ صاحب کے دو بھائی پاکستان میں مقیم ہیں۔ ایک بھائی بقیدِ حیات ہیں جن کا نام عبدالرشید ہے۔ عبدالرشید کی شریکِ حیات ہماری تائی اماں کی سگی بہن ہیں جن کا نام فصیحہ بیگم ہے جن کا انتقال دو یا تین سال قبل پاکستان میں ہوا۔

وجدؔ صاحب سے زندگی میں ایک بار ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات ۱۹۸۱ء میں ہوئی تھی۔ وجدؔ صاحب ہمارے والدِ محترم کے چچازاد ماموں اور ہماری دادی کے سگے چچازاد بھائی تھے۔ ہماری رشتہ داری کے حساب سے یہ پہلا تعارف ہوا۔ کہنے لگے کہاں تک تعلیم حاصل کی۔ جواب میں، میں نے کہا بی اے انگریزی سے کیا اور اردو سے ایم اے کیا۔ بہت خوش ہوئے۔ میں نے کہا کہ میں بھی شعر کہتا ہوں۔ کہنے لگے شعر مت سنانا۔ پھر اچانک پوچھنے لگے، کیا تخلص فرماتے ہیں۔ میں نے کہا ارشدؔ نظر۔ جب ہم اُن سے ملے تو اُن کے ہاتھوں میں ''انتخابِ وجدؔ'' تھا۔ خود ہی اپنے انتخاب کا مطالعہ فرما رہے تھے۔ ''اجنتا'' ''ایلورا'' کی نظموں پر جگہ جگہ پینسل کے نشانات تھے۔ کہنے لگے ایک ہی کتاب رہ گئی ہے۔ اور پھر ''انتخابِ وجدؔ'' عزیزی ارشدؔ نظر کیلئے اپنے دستخط کے ساتھ عنایت فرمائی اور نصیحت کی ''شعر گوئی کے ساتھ ساتھ مطالعہ کی طرف بھی دھیان دو''۔ پھر ہمارے والد صاحب کی خیریت پوچھی۔ ہم نے کہا'' مزے میں ہیں'' پھر ادیبؔ مالیگانوی کی خیریت پوچھی۔ کہنے لگے ہمارے معیار کا مالیگاؤں میں ایک ہی شاعر ہے، وہ ہیں ادیبؔ صاحب۔ ادیبؔ صاحب کی خیریت بار بار پوچھتے رہے۔ جب ہم نے رخصت چاہی تو کہنے لگے شعر سناؤ۔ ہمارا تعلق بھی وجدؔ گھرانے سے ہے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک غزل کے چند اشعار سنا ڈالے۔ جب یہ شعر اُن کے سامنے پڑھا:

شام ہوتے ہی ڈوب جاتا ہے
دن کا سورج بھی بے وفا ٹھہرا

کہنے لگے ''ٹھہرا'' کی جگہ ''نکلا'' کرلو۔ ہم نے بسر وچشم اس اصلاح کو قبول کرلیا۔ ۱۹۸۳ء میں وجد صاحب کا انتقال ہوا تو ہم نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''برگِ درخشاں'' (سنِ اشاعت ۸۴) جس کا انتساب سکندر علی وجدؔ کے نام سے تھا۔ ان کی پُرعظمت شخصیت اور فن کی روشنی میں انتساب پر یہ شعر لکھ کر خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔

بے کاوشِ جگر ہے ہر اک نقش رائیگاں
زندہ ہے دیکھ تیشہ کسی جاں گداز کا

وجدؔ صاحب کی یاد میں اپنے جذبات کا اظہار یوں کیا تھا۔

نظم و غزل کی آبرو بن کر رہا ہے وہ — نقش و نگار فکر کا پیکر رہا ہے وہ
کیسے بھلائے کوئی اجنتا کے یہ نقوش — بستی میں پتھروں کی جو آزر رہا ہے وہ

لفظوں کے سنگ ریزوں پہ لالہ بکھر گیا — یا جیسے ماہتاب کا ہالہ بکھر گیا
ارضِ دکن کو ناز تھا جس وجد پر نظرؔ — سب کو سمیٹ کر وہ اجالا بکھر گیا

ہمارے عزیز بزرگوں سے یہ روایت سنی ہے جب وجد صاحب پیدا ہوئے تو ان کے والد سید عبد الغفور اس فکر میں غلطاں تھے کہ کیا نام رکھا جائے۔ اچانک ایک صوفی منش سید عبد الغفور صاحب کے پاس سے یہ کہتا ہوا گزرا ''یہ اپنے وقت کا سکندر ہوگا۔'' بس اسی صوفی منش کی بات سن کر وجدؔ کے والد محترم نے ان کا نام میر سکندر علی رکھا۔

سکندر علی وجد صاحب سے زندگی میں صرف ایک بار مل سکا جس کا قلق مجھے مدتوں رہے گا۔ ان کی یاد میں، میں نے ایک غزل کہی تھی، میرے شعری مجموعے ''برگ درخشاں'' میں ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

نکلے نہ آئینوں کی شکن در شکن سے ہم
سنگ ہوس سے لڑتے رہے بانکپن سے ہم

بوئے وفا کی راہ نمائی عجیب ہے
دار ورسن کو پہنچے تری انجمن سے ہم

لپٹی ہے کس کی یاد کی خوشبو کچھ اس طرح
الجھا ہے ہم سے پیرہن اور پیرہن سے ہم

کرتی ہے کس کے ساتھ یہاں زندگی وفا
جینے کو یوں تو جیتے رہے حسن ظن سے ہم

آنکھوں میں کوئی ''برگ درخشاں'' کا خواب ہے
پوچھیں گے حال صبح کی پہلی کرن سے ہم

ان کا جو لطف خاص ہوا ہم پہ اے نظرؔ
نکلے نہ ان کی زلف شکن در شکن سے ہم

''عمرہا سوختہ ام تا سخنے یافتہ ام'' بیاض مریم کے پہلے صفحہ پر ان کی تصویر کے نیچے لکھا ہوا ملتا ہے۔
اسی طرح ''انتخاب وجد'' کے پہلے صفحہ پر تصویر کے نیچے یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

تب گرم سخن کہنے لگا ہوں کہ میں اک عمر
جوں شمع ، سر شام سے تا صبح جلا ہوں

''انتخاب وجد'' کا انتساب ''حسین'' کے نام ہے۔ اقبال کے اسی مصرع کے ساتھ۔۔۔۔ دلبری با قاہری پیغمبری است۔ قاہری کے ساتھ دلبری (دراصل) پیغمبری ہے۔
اور ''بیاض مریم'' میں ''نذر مریم'' کے لئے یہ شعر ملتا ہے۔

جرم من است ، پیش تو گر قدر کم من است
خود کردہ ام پسند ، خریدار خویش را

(اگر تیرے سامنے میری قیمت کم ہے (تو یہ) میرا جرم ہے (کیونکہ) اپنے خریدار کو میں نے خود پسند کیا ہے۔) فارسی کا یہ شعر پڑھ کر اردو کے کسی شاعر کا یہ شعر ذہن میں گونجنے لگتا ہے۔

خدا سے بھی ہے تجارت کا سلسلہ جاری
گناہ پیش کیے اور کرم خرید لیا

اسی طرح ''اوراق مصور'' کے شروع میں یہ مصرعہ ملتا ہے۔ ''مستانہ سخن می رسد از دل بہ لب ما (دل سے ہمارے لب تک مستانہ سخن پہنچتا ہے مستانہ سخن ہمارے لب تک دل سے پہنچتا ہے۔)

بطور امثال مندرجہ مصرعوں یا اشعار سے وجدؔ صاحب نے اپنی شاعری، اپنی شخصیت، اپنی سیرت اور اپنے مزاج کے ساتھ ساتھ فن کی خصوصیت کی طرف واضح اشارہ کر دیا ہے۔ سکندر علی وجدؔ کی طبع سنجیدہ اور ستھری تھی۔ جاہ جلال کی طمع اور اموال کا لالچ ان کے قدموں کو متزلزل نہ کر سکا۔ وہ قلب پاکیزہ کے طالب اور فکر و نظر کے بانکپن کے خواہاں تھے۔ سکندر علی وجدؔ حضرت زرزری بخش کے حضور یوں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔

اے صاحب الطاف و کرم حضرت زر بخش
میری شبِ تاریک کو انوار سحر بخش
دنیا میں جو نایاب ہے وہ چیز عطا کر
زر کی مجھے کچھ فکر نہیں ذوق نظر بخش

محولہ بالا مثالوں سے ہم وجد صاحب کی فکری و فنی قد و قامت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت و مزاج کا بھی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح فن کار کو ان منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ جب کہیں شعر کہنے کا سلیقہ حاصل ہوتا ہے۔ اس دشت کی سیاحی میں یک عمر گزارنے کے باوجود فن کار مطمئن نہیں رہتا۔ سکندر علی وجد نے ''میں اور میرا فن'' کے عنوان سے اپنی شاعری کے بارے میں بہت خوبصورت اظہار کیا ہے۔ آج کل کی نئی نسل کے شعراء کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ ڈیڑھ مصرعہ کی شاعری کرتے ہیں یا پھر لاکھوں اشعار کہہ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم میرؔ، غالبؔ و اقبالؔ سے بڑے ہیں۔ اس بیان کو پڑھ کر ہمارے شعراء کو سبق حاصل کرنا چاہئے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''۔۔۔۔۔۔ میں اپنے فن کو دشمن کی نظر سے دیکھتا ہوں۔ شاعری میں آمد کو الہام اور آورد کو گناہ نہیں سمجھتا۔ اعلیٰ تخلیق میں سو میں ایک حصہ آمد اور سو حصے آورد ہوتی ہے۔ میں ہمیشہ اپنی نظموں میں ترمیم و تنسیخ اور اضافہ کرتا رہتا ہوں۔ تمام فنون لطیفہ کی طرح شاعری بھی بڑا ریاض چاہتی ہے۔ اعلیٰ شاعری کی منزل تک پہنچنے کا کوئی آسان اور قریب کا راستہ نہیں ہے۔ برسوں کی محنت، مشق اور مطالعے کے بعد اچھا شعر کہنے کا سلیقہ آتا ہے میری نظمیں ایلورا آٹھ برس میں، اجنتا انیس برس میں اور کاروانِ زندگی 30 برس میں مکمل ہوئیں لیکن اب بھی میں مطمئن نہیں ہوں۔

ہے حسن عمل شعر ، خردمند جنوں کا
تخلیق سخن ، جوہر الماس گری کا

بقول فضیل جعفری۔۔۔ ''مبالغے اور تصنع سے پاک ایک سچا اور کھرا بیان ہے جو بجائے خود وجد کی شاعری پر جامع تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اتنا کھرا اور بے باک اظہار وجد جیسا غیر معمولی شخص ہی کرسکتا ہے۔'' ۔۔۔۔ کہیں اپنی شاعری کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتے نظر آتے ہیں۔

''۔۔۔۔۔ میری شاعری، میری زندگی انسان کی عظمت اور ترقی ہندوستان کی تاریخ و سیاست۔ یہاں کے فنون لطیفہ سے طاقت اور حسن حاصل کرتی رہی۔'' ۔۔۔۔ ان کے اس دعوے کی بنیاد پر ہم متعدد نظمیں پیش کر سکتے ہیں۔ مثلاً اجنتا، ایلورا، رقاصہ، طیبہ، مزدوروں کا پیغام، حسین کی تصویریں، سارنگی، مہاتما، تاج محل، پیام اقبال وغیرہ۔

نظموں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ایک فن کار فنون لطیفہ سے طاقت اور حسن حاصل کرسکتا ہے بشرطیکہ اس میں کہنے کا سلیقہ ہو۔ اس سلیقے کا اظہار وجد صاحب اس طرح کرتے ہیں۔

جگر کے خون سے کھینچے گئے ہیں نقش لاثانی — تصدق جن کے ہر خط پر تحیر خانۂ مانی
مشکّل ہے شباب و حسن میں تخیّلِ انسانی — تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی
حسینانِ خود آراء کا جنوں سرتاج ہے گویا — یہاں جذبات کے اظہار کی معراج ہے گویا
جہاں چھوڑا خوشی سے جاوداں پیغام کی خاطر — صف آرا تھے شکستِ گردشِ ایام کی خاطر
جھکایا سر نہ اپنا شہرت و انعام کی خاطر — جیے بھی کام کی خاطر مرے بھی کام کی خاطر
زمانے کی جبیں پر عکس چھوڑے ہیں نگاہوں کے — رہیں گے نقش انکے نام مٹ جائیں گے شاہوں کے

اردو کے معتبر نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے ''اجنتا'' ''ایلورہ'' کو کس بنیاد پر معمولی نظمیں کہا ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ اس قسم کے تبصرے سے ''اجنتا'' ''ایلورہ'' کی اہمیت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ آرٹ کے نقطۂ نظر سے فاروقی صاحب کو یہ مصرعہ اپیل نہ کرسکا۔۔۔۔۔ ''تقدس کے سہارے جی رہا ہے ذوق عریانی''۔ حیرت ہے۔ بہر حال فن کسی تبصرے کا محتاج نہیں ہوتا۔ اعلیٰ تخلیق خود کو منوا لیتی ہے۔ منوائی نہیں جاتی۔ میرے نزدیک اس قسم کی ہزار مخالفت کے باوجود ''اجنتا'' ''ایلورہ'' اردو کی بہترین

نظموں کے انتخاب میں جگہ پا چکی ہیں۔ ''اجنتا'' ''ایلورہ'' ہمارے تاریخی وتہذیبی تمدن پر شاہکار نظمیں ہیں۔ ہماری پسند اور ناپسند کا معیار کسی بھی تخلیق کے بارے میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اپنی پسند اور اپنی نگاہ کا عمل کبھی بھی شاعر کے ساتھ انصاف نہیں کر پاتا۔ وجد صاحب اپنی شاعری سے باخبر تھے۔ اس لیے وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھے۔

دوسو برس میں وجدؔ سراجؔ و ولیؔ کے بعد
اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاک دکن سے ہم
کمندِ گردشِ ایّام کے اسیر نہیں
نقوشِ دست عقیدت فنا پذیر نہیں
غلام مرضیِ حالات حسن کار نہیں
کمال فکر کے شہکار ، اشتہار نہیں

ظ۔ انصاری نے ''اوراقِ مصور'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''۔۔۔۔۔ اس مجموعے میں کئی ایسی نظمیں ملتی ہیں جو خلوص دل کی آنچ میں تپ کر نکلی ہیں۔ ان میں وہی شدت ہے وہی نرمی۔ مثال کے طور پر ''والد مرحوم'' یا مہاراجہ کشن پرشاد'' جن کی قدر و قیمت سے وہ خود بھی آگاہ نہیں معلوم ہوتے۔''

ظ۔ انصاری کا یہ بیان غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ تاریخی اور ادبی شخصیتوں پر سکندعلی وجدؔ نے یوں ہی نہیں اظہار خیال کیا ہے۔ ظ۔ انصاری اس کے بعد وجد کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں۔

''۔۔۔۔۔ سکندر علی وجدؔ ایک اعلیٰ درجے کے دوست، صف اول کے سخن فہم، سخن شناس، نہایت ہی منظم اور مُدّون آدمی تھے۔''

ظ۔ انصاری نے انہیں کہیں نکتہ پرور کہیں نکتہ سنج کہا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وجدؔ صاحب اپنی نظموں کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں۔ خود بخود ظ۔ انصاری کا یہ بیان غیر اہم ہو جاتا ہے۔

نظم مہاراجہ کشن پرشاد پانچ بند پر مشتمل ہے۔ آخری بند میں بڑا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔

در بنائے نہ گئے تیرے خزانے کے لیے
ہاتھ ہیں وقف زر و مال لٹانے کے لیے

درد ہے دل میں ترے سارے زمانے کے لیے
کی سخاوت نہ کبھی تو نے دکھانے کے لیے
یہ ترا حسن عطا دل کو بہت بھاتا ہے
کر کے سائل پہ کرم آپ ہی شرماتا ہے

اسی طرح ''والدمرحوم'' کی یاد میں جو نظم لکھی ہے اس کا اختتام یوں ہوتا ہے۔

کہنے کو داغ ہجر دیا یاد کے لیے
چھوڑا غم ایک خاطر ناشاد کے لیے
کچھ نونہال گلشن آزاد کے لیے
رکھا نہ آسرا کوئی اولاد کے لیے
مرد خدا نے دولت بیدار چھوڑ دی
لخت جگر کے واسطے تلوار چھوڑ دی

اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے ادیب و نقاد سب جانتے ہیں کہ سکندر علی وجدؔ نستعلیق قسم کے انسان تھے۔ فن شاعری کے علاوہ دیگر فنون لطیفہ سے بھی آگہی رکھتے تھے۔ بت گری، موسیقی، مصوری، آثارِ قدیمہ کی تاریخ و تمدن پر گہری نظر رکھتے تھے۔ روایت کے ساتھ تبدیل ہوتی ہوئی اقدار کو دیکھا بھی، پڑھا بھی اور پرکھا بھی لیکن کلاسیکی انداز کو انہوں نے اپنے اظہار کے لئے بہترین وسیلہ قرار دیا۔ عصری تقاضوں کے اظہار میں انہوں نے کلاسیکی انداز کو اختیار کیا۔ اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔

(ماحول احمد آباد 69ء)

دن ہے یا رات یہاں کس کو خبر ہوتی ہے
زندگی موت کے سائے میں بسر ہوتی ہے
امن و انصاف کا احسان جتانے والو
آج ہر گام پہ توہین بشر ہوتی ہے
کن مراحل سے گزرتے ہیں اسیرانِ ستم
رات زنداں میں تو مقتل میں سحر ہوتی ہے
روز ملتی ہے مہکتے ہوئے پھولوں کو سزا
روز گلشن کی زمیں، خون سے تر ہوتی ہے
وقت کہتا ہے کہ تاریک ستم زاروں میں
روشنی دیر سے ہوتی ہے مگر ہوتی ہے

(شہر آشوب، بھیونڈی 75ء)

شہر میں ظلم کے آثار ملے　　آدمی نقش بہ دیوار ملے
محفل عیش میں اغیار ملے　　اپنے احباب سرِ دار ملے
راستے امن کے دشوار ملے　　لوگ آمادۂ پیکار ملے
خطۂ مہر و وفا دیکھ لیا　　کتنے بے باک جفا کار ملے
کوئی آزاد نہیں شاد نہیں　　سب مصیبت میں گرفتار ملے
علم و دانش کی گزرگاہوں میں　　ہر قدم عقل کے بیمار ملے
باغباں چند ہی گل کافی ہیں　　کون کہتا ہے کہ گلزار ملے
وجدؔ کو یاد ہے رُودادِ چمن　　کل جہاں گل تھے وہاں خار ملے

سکندر علی وجدؔ جمالیاتی اقدار کے شاعر تھے جہاں ان کی نظموں میں آہنگ بلند ہوتا ہے وہیں غزلوں میں ہلکے پھلکے اشعار کہتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے۔ نظموں میں ان کے الفاظ کی تراش خراش پر اس کی سجاوٹ پر آتش کے اس شعر کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

لیکن غزلوں میں لہجے کا دھیما پن کلاسیکی رچاؤ کے ساتھ ساتھ والہانہ انداز اور نغمگی نمایاں ہے۔ ان کی غزلوں کے بعض اشعار کو ہم پورے طور پر سہل ممتنع نہیں کہہ سکتے لیکن براہ راست سادگی اور انداز بیان کا اظہار سلیقے سے ملتا ہے۔

جانے والے کبھی نہیں آتے　　جانے والوں کی یاد آتی ہے
مصیبت میں بھی بارہا وجدؔ مجھ کو　　خدا جانتا ہے صنم یاد آئے
کانٹوں میں جو ہنس رہا ہے پیہم　　وہ پھول چمن کی آبرو ہے
اے صبا لالۂ کم ظرف سے اتنا کہہ دے　　دل کی توہین ہے داغوں کو نمایاں کرنا
کون اس طرح مرے پاس آیا　　رقص میں موج صبا ہو جیسے

ہر غزل میں یہی محسوس ہوا
میں نے کچھ ان سے کہا ہو جیسے
اس تکلف سے کھلا غنچہ دل
غنچۂ بندِ قبا ہو جیسے
یوں تجھے یاد کیا کرتا ہوں
تو مجھے بھول گیا ہو جیسے
دلکشی رنگ پیرہن کی ہے
گل میں خوشبو ترے بدن کی ہے
وجد اردو کی آبرو ہے غزل
یہ نوازش ترے وطن کی ہے
یہ اندھیرے کے تذکرے کب تک
دوستو روشنی کی بات کرو
خاکساری کو چھپانے کے لیے
وجد مغرور نظر آتا ہے
وجد تم ہی ذرا بدل جاؤ
ساری دنیا بدل نہیں سکتی
میکدے میں سر جھکائے شیخ جی
خشک لب آئے تھے، دامن تر چلے
درد و غم کے جادے پر عمر کا سفر تنہا
ہر قدم پہ ہنگامہ، آدمی مگر تنہا

قمر اقبال نے ان کے انتقال پرُ ملال پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"------وجد صرف ایک اسم نہیں ایک شخصیت نہیں بلکہ اہل دکن کے لئے ایک عہد کا نام ہے۔اس عہد ساز ہستی نے ضلع اورنگ آباد کے تعلقہ ویجاپور کے موضع شروالا سے مشتِ غبار کی طرح پرواز کی اور اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث دکن کی خاک نے ارض دہلی سے رشتہ جوڑ لیا۔اور "ہنوز دلی دور است" والی بات غلط ثابت کر دی۔وجد کی حب الوطنی کا ثبوت صرف یہ نہیں کہ ان کے نہرو خاندان سے بڑے مراسم رہے بلکہ وطن پرستی کی خوشبو ان کی شاہکار و لازوال نظموں "اجنتا" "ایلورہ" سے پھوٹتی ہے جس کا ہر غنچہ اور ہر لفظ ایک پھول کی طرح رنگ و بو سے مزین ہے۔ مجھے ایک دکنی باشندے کی حیثیت سے فخر ہے۔ان دو نظموں کی مثال کسی اردو شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔وجد کو اپنی مٹی سے بہت پیار تھا۔اسی لئے دہلی تک جا کر وہ اس مشت غبار کی خاطر اورنگ آباد لوٹ آئے جو اس علاقے کی امانت تھی۔شاید ایسے ہی لمحے کی بات ہوگی کہ میں نے ایک شعر کہا تھا جو اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

خود کی خاطر نہ زمانے کے لئے زندہ ہوں
قرض مٹی کا چکانے کے لئے زندہ ہوں

"ازل سے قافلہ زندگی غبار میں ہے"۔ کہنے والا شاعر خود مشت خاک بن کر اس جہاں سے روٹھ گیا۔ وجد ہمارے درمیان نہیں ہیں بقول شاعر۔ "جانے والے نہیں آنے والے" لیکن وہ آج بھی اپنی نظموں

اور غزلوں میں زندہ ہیں۔

ہنس کے شاعر نے موت سے یہ کہا

اے سبک دست زندگی دشمن
وقت کی فصل کاٹنے والی
ایک زندہ خیال کی دھن میں
گنگناتے ہوئے مسرت سے
ایسے الفاظ میں نے لکھے ہیں
جن کو تو بھی مٹا نہیں سکتی

یہ رنج نہ یہ جور وستم یاد رہیں گے　　خوشیوں نے جو بخشے ہیں وہ غم یاد رہیں گے
یادوں سے چراغاں ہے شبستانِ سخن میں　　اے حسن ترے نقشِ قدم یاد رہیں گے
ممکن ہی نہیں نقشِ وفا دل سے مٹانا　　اے بھولنے والے تجھے ہم یاد رہیں گے
اس منزل پرشور سے خاموش گزر جا　　ہے جن کی یہاں دھوم وہ کم یاد رہیں گے

وجدؔ کی شاعری کو سمجھنے کے لئے اہل جنوں کی ضرورت ہے۔ اہل خرد اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اسی لیے انہوں نے کہا ہے۔

اہل جنوں فردوس بہ داماں
اہل خرد ، فی نار جہنم
وجد کے بعد اے زمینِ سخن
کتنے شاہین زیر دام آئے
متاعِ سخن کے جواہر سجا کر
نگاہِ خریدار سے کھیلتا ہوں

سینکڑوں معانی ہیں سرسری اشاروں میں
حسن کار کرتا ہے بات استعاروں میں

■■■

غزل کی نئی جہتوں کا شاعر

فیض احمد فیضؔ

(آمد: ۱۹۱۱ء ------ رخصت : ۱۹۸۴ء)

مقبولیت اور شہرت سب کے حصّے میں کہاں۔اس لحاظ سے فیضؔ بڑے خوش نصیب رہے کہ انہیں مقبولیت اور شہرت دونوں ملی۔لیکن میرؔ و غالبؔ نے شاعرانہ انداز کا جو پیمانہ آنے والے عہد کے لئے دیا اس پر تو غزلوں میں نہ جوشؔ، نہ فراقؔ اور نہ فیضؔ ہی پورا اُترتے ہیں تاہم فیضؔ کی شاعری اپنے ہم عصروں میں مثلاً جاں نثار اختر، جذبی، مجروح، مخدوم اور سردار سے الگ رہی۔یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام ترقی پسند شاعری میں ایک الگ وقار کے ساتھ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔

فیضؔ کی شاعری جغرافیائی حدود سے نکل کر عالمی سطح پر گونجنے لگی۔فیض احمد فیضؔ کی شاعری شروع شروع میں رومانی مزاج کی حامل تھی جیسا کہ ہر نوجوان شاعر، شاعری کرتا ہے۔رفتہ رفتہ ان کی شاعری نے رومانیت سے نکل کر حقیقت کے آنگن میں قدم رکھنا شروع کیا۔جہاں سے ان کی زندگی کی راہیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔تصوّرِ جاناں سے نکل کر حقیقتِ جاناں میں آپہنچتے ہیں یہی وجہ ہے کہ زمانے کی گردشوں کے ساتھ ان کی شاعری بھی ایک نئے رُخ کا پتہ دیتی ہے۔قید خانے کی زندگی نے ان کی شاعری پر کافی اثر ڈالا۔ان کے انقلابی رویّے نے سوچ کے دائرے کو وسعت بخشی۔وقت کے تقاضے کو نظریات کے سانچے میں انہوں نے بڑی عمدگی سے ڈھالا ہے۔ان کی شاعری میں جہاں اشتراکی نظریات کا پرچار ہے وہاں سطحیت برقرار ہے۔جہاں نظریات، پروپگنڈے کا شکار نہیں ہوئے وہاں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کے یہاں داخلیت اور خارجیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے اور ان کی شاعری کا یہ دھیما لہجہ انہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں۔

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے
متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

فیضؔ نہ اسیرؔ، ذوقؔ اور امیرؔ مینائی کی طرح رعایت لفظی میں مبتلا تھے اور نہ ہی انشاء مصحفی اور شاہ نصیر کی طرح سنگلاخ زمینوں میں شعر کہتے تھے جیسا کہ سبھی جانتے ہیں اردو کی ابتدائی شاعری فارسی زدہ تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری پر فارسی کا غلبہ ہونے نہیں دیا۔ لیکن ان کے یہاں فارسی زبان کا عکس ضرور ملتا ہے جو ان کے تخیل اور وجدان کے ساتھ بہتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری میں ترکیبیں دل پر گراں نہیں گذرتیں اور دل و دماغ کو جمالیاتی کیفیت سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ بقول فضیل جعفری

''انہوں نے جو شعری ورثہ چھوڑا ہے وہ ہمیشہ وصف ہے کہ کہنے کو تو فیض احمد فیض اپنے مجموعی شعری رویّے کے اعتبار سے سیاسی شاعر کہے جاسکتے ہیں۔ لیکن انہوں نے شعری جمالیات پر سیاسی فکر کا غلبہ بھی نہیں ہونے دیا۔ سیاسی دانشور فیض کے مقابلے میں شاعر فیض ہمیشہ ہی زیادہ نفیس زیادہ عقلمند زیادہ طاقتور شاعر ثابت ہوا ہے۔ اسی سبب سے ان کی سیاسی نظمیں بھی مثلاً زنداں کی ایک صبح، اے روشنیوں کے شہر، دریچہ، آج بازار میں پابجولاں چلو اور درجنوں دوسری مشہور نظمیں ہیں۔ ہمیں بہتر مادّی اور سماجی زندگی کی بجائے بہتر رومانی اور بہتر جمالیاتی زندگی کے راستے پر ڈالتی ہیں۔ ان کی شاعری میں زندگی کی بے رحمیوں اور برہنہ حقیقتوں کا احساس اور اظہار نمایاں ہے۔ لیکن انہوں نے اپنی شاعری پر اپنی نظریاتی دکان کا سائن بورڈ نہیں بننے دیا۔ میرے نزدیک اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ فیض نے نئے سیاسی اور عمرانی خیالات کو نہ صرف اپنانے بلکہ اپنے اندر جذب کر لینے کے ساتھ اردو شاعری کی بیش قیمت اور بہترین روایات سے اپنا رشتہ برقرار رکھا ہے۔ ترقی پسند شاعروں میں خصوصی طور پر فیضؔ کو اور اس کے ہم عصر

غزل گو مجروح نے جس طرح اردو کی بہت سی روایتی علامتوں اور لفظیات کو محسوس کیا اور برتا ہے اس سے ان چیزوں میں نئی معنویت اور نئے بُعد پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہی گُر تھا جس کی بنا پر فیضؔ کی سیاسی حسیّت اور جمالیاتی حسّیت میں کوئی تضاد یا ٹکراؤ نہیں پیدا ہونے دیا سماجی اور سیاسی حقائق پر ان کے اشعار بھی ذہن و حواس کی حدوں سے گذر کر دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتے ہیں۔"

میرے خیال میں فیضؔ نے کسی شاعر کی پیروی نہیں کی بلکہ انہوں نے اپنے عہد کا ساتھ دیا جس عہد میں وہ سانس لے رہے تھے اس سے وہ کیسے منہ موڑ سکتے تھے۔ یقیناً فیضؔ کی شاعری اپنے عہد کی شاعری ہے۔ فارسی ترکیبوں کو وہ اتنی خوبصورتی سے برتتے ہیں کہ وہ زبان پر خود بخود چڑھنے لگتی ہیں۔ لیکن شاعرانہ خیال کو فیض کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیتے۔ فارسی ترکیبیں خیال کے ساتھ ساتھ خود بخود مناسب اور موزوں سانچے میں ڈھلنے لگتی ہیں ان کے کلام میں فارسی ترکیبیں ملتی ہیں۔ جو نہایت دلکش اور حسین ہیں جیسے کہ ہمیں اقبالؔ اور غالبؔ کے کلام میں ملتی ہیں۔ گو ان کی شاعری غالبؔ کی طرح فلسفیانہ خیال نہیں رکھتی۔ لیکن دل کے جذبات کی پیروی ضرور کرتی ہے۔ اضافتوں کی بھیڑ میں فیضؔ بھی غالبؔ کی طرح کہیں کہیں ضرور بھٹک جاتے ہیں۔ لیکن ان چند خامیوں کے باوجود فیضؔ کی عظمت جوشؔ و فراقؔ سے کچھ کم اہم نہیں ہے۔ جس طرح نذرالاسلام کی شاعری میں ہمیں انقلابی روح نظر آتی ہے اسی طرح فیضؔ کے یہاں انقلابی روح کارفرما ہے۔ فیضؔ نے اپنی شاعری سے وہی کام لیا ہے۔ جو نامق کمال نے ترکی شاعری میں انقلاب برپا کرنے کے لئے کیا تھا۔

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایّام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
پھر آگ بھڑکنے لگی ہے ساز طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہیں دیدۂ تر سے

وہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رو سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سر بزم یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ وفا یہ رسن و دار کرو گے کیا
جنہیں جرم عشق پہ ناز تھا وہ گناہ گار چلے گئے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت نا گوار گذری ہے

فیضؔ نے روایت کا احترام کیا اور راویت سے فیض بھی اٹھایا۔ روایتی الفاظ و علائم کو فیضؔ نے عصری حسیّت کے تقاضے کے ساتھ برتا ہے۔ لیکن اس خوبی سے کہ ان علائم میں ایک نئی معنویت و مفہوم کی تہہ پوشیدہ ہے جو سماجی ورثہ کی پاسداری کے ساتھ ان کے اشعار میں جگہ پاتی ہے۔ روایتی الفاظ و علائم کو سمجھنے کے لئے شعور و ادراک کی ضرورت ہوتی ہیکہ شاعر نے کس پس منظر میں ان روایتی و فرسودہ علائم کو کس معنی و خوبی کے ساتھ برتا ہے فیض کا ایک قطعہ ہے جس میں الفاظ گو روایتی و فرسودہ ضرور ہیں لیکن عصری حسّیت کی سفاکیوں کو بڑے نازک اور اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے جس کو پڑھ کر ہم متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

جو محتسب سے کوئی تار پیرہن کا بچا
دراز دستیٔ پیر مغاں کی نذر ہوا
اگر جراحتِ قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہوا

فیض کی بیشتر غزلیں طرحی ہیں۔ لیکن اس رنگ و آہنگ کے ساتھ وہ اپنے عہد کی مرقع ہیں۔ وہ اپنے عہد کی دھڑکنوں کو شاعرانہ تخلیقی سرچشمے کے ساتھ خوبی سے برتتے ہیں۔ فیض حالی کی طرح مصلحانہ دماغ نہیں رکھتے بلکہ سیاسی دماغ رکھتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالی کی طرح ان کی طبیعت حساس تھی۔ ان کے اندر حالی کی طرح قوم کا دکھڑا نہیں بلکہ عالم انسانیت کا درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری بہ نسبت حالی کے اردو ادب میں ہمیشہ درخشاں رہے گی۔ بقول عبدالستار دلوی:

''انہوں نے ترقی پسند تحریک کو اپنے نصب العین کو، نرم گفتاری اور سبک آہنگی کے ساتھ پیش کیا اور اپنے لہجے میں میرؔ کا وہی سوز و گداز برقرار رکھا جو انہیں ترقی پسندوں کے کارواں میں شریک اپنے ہمراہیوں سے ممتاز کرتا ہے۔''

البتہ یہاں مجروح کی اس بات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے ایک انٹرویو کے دوران کہی تھی۔ ''اردو ترقی پسند شاعری کا میرؔ چلا گیا۔'' فیضؔ، میرؔ نہیں ترقی پسند شاعری کے میر کارواں ضرور تھے۔ نہ تو فیضؔ اردو شاعری کے میرؔ ہیں نہ غالبؔ بلکہ ستار دلوی کی اس بات سے اتفاق ضرور ہے کہ '' فیضؔ اردو کی ترقی پسند شاعری کے میر کارواں تھے۔'' اور یہ سچ بھی ہے فیضؔ دراصل لطیف کیفیات و جذبات کے شاعر ہیں۔ لطیف کیفیات و جذبات میں ڈوبی شاعری نظریاتی آنچ سے ایک حد تک محفوظ رہتی ہے۔ فیضؔ نے نظریاتی شاعری کی آبرو اس طور سے رکھی کہ اس میں لہجہ کا دھیما پن ضرور برقرار رہتا ہے۔ لیکن آفاقی شاعری کسی ''ازم'' کے ذریعے زندہ نہیں رہتی۔ اس لئے اس میں فیضؔ جیسے اعلیٰ اور باصلاحیت شاعر کے ساتھ لفظ ترقی پسند سے گریز کرنا چاہیئے۔ تمام ''ازم'' مرجاتے ہیں فن کار کے فن پارے کو کسی ''ازم'' کے آئینے میں نہیں پرکھنا چاہیئے۔ بلکہ وہ جوہر تلاش کرنا چاہیئے جو ہمارے معاشرے میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فیضؔ ترقی پسند نظریئے سے زندہ نہیں رہیں گے۔ بلکہ آفاقی قدروں کے علمبردار کی حیثیت سے ان کا نام اردو ادب میں زندہ رہے گا۔

جان جائیں گے جاننے والے — فیضؔ فرہاد و جم کی بات کرو
چاند پھر آج بھی نہیں نکلا — کتنی حسرت تھی ان کے آنے کی
اب کوئی پوچھے بھی ہم سے تو کیا شرح حالات لکھیں — دل دھڑکے تو درد سنائیں درد تھمے تو بات کریں
لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں — کس کس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی
غم جہاں ہو رخِ یار ہو کہ دست عدو — سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا
ہمیں سے اپنی نوا ہمکلام ہوتی رہی — یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی
کب نظر آئے گی بے داغ سبزے کی بہار — خون کے دھبّے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
اک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے — اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے
یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

فیضؔ نے غلامی و آزادی کی کشمکش کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس کی تہہ تک ایک عام قاری بھی

آسانی سے اتر سکتا ہے۔ ظلمت اور صبح کے علامتی لفظ کو اس خوبصورتی سے برتا ہے کہ قاری کے سامنے حقائق کی ایک دنیا روشن ہو جاتی ہے۔ داغ داغ اجالا۔ شب گزیدہ سحر اور یہ وہ سحر تو نہیں۔ ان لفظوں کی جمالیات کی تہوں میں چھپے ہوئے وسوسے کو شاعر نے جس خوبصورتی کے ساتھ منظر اور پس منظر کے استعارے میں پیش کیا ہے وہ سارے حقائق کی جیتی جاگتی تصویر قاری کے ذہن میں آجاتی ہے۔ مظلوم انسانوں کے دکھ درد کو انہوں نے اپنی شاعری میں براہ راست پیش نہیں کیا۔ بلکہ ان کی زندگی کے حقائق و مسائل کو ہمیشہ بالواسطہ پیش کیا۔ جس کی وجہ سے ان کی شاعری دوام حاصل کرتی ہے اور یہی فیض کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

باقی ہے لہو دل میں تو ہر ایک اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش دل ریزہ ریزہ گنوادیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو، تن داغ داغ لٹا دیا

کرو کج جبیں پر سرِ کفن، مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرور عشق کا بانکپن پس مرگ ہم نے بھلا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو صفِ دشمنان کو خبر کرو
وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر وہ حساب آج چکا دیا

وہ بتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوف خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں کہ خیال روز جزا گیا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حساب خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

غالبؔ کا شعور اپنے اندر ہمہ گیریت رکھتا ہے۔ فیض کے یہاں اس شعور کی تھوڑی بہت جھلک ضرور ملتی ہے۔ ان کا شعور ان کے کلام میں کائنات اور زندگی کے وسیع ترین پیچیدہ شکلوں سے کہیں کہیں ہم آہنگ ضرور ہوا ہے۔ بہر حال آج کے ترقی پسند دور میں اردو زبان کافی منجھ چکی ہے پھر بھی افسوس کا مقام ہے کہ میرؔ و غالبؔ اور اقبالؔ کے بعد کوئی اور عظیم شاعر نہیں ملا۔

شاعری میں جب دلی واردات و کیفیات کی ترجمانی رمزیت و ایمائیت سے آگے شعور و ادراک کی سرحدوں سے ماوراء ہو جاتی ہے۔ تو آفاقیت کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے اور یہ قدر ہر کسی کو نصیب نہیں۔ فیض کا یہی شعری کارنامہ کچھ کم اہم نہیں۔ میں فیضؔ کو فیضؔ ہی کے شعر سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

■■■

''اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم''

مجروحؔ سلطان پوری

(آمد : ۱۹۱۹ء ------- رخصت : ۲۰۰۰ء)

۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک جب غزل دشمنی عروج پر تھی تب بھی مجروح نے غزل کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ انہوں نے اپنی قوتِ فکر کا اظہار غزل ہی میں کیوں کیا خود انہی کی زبانی سُنتے چلئے۔

''میں نے صنف غزل کو اپنے لئے اس لحاظ سے بہتر جانا کہ اس تحریک کا ایک کامیاب شعرا پنے اختصار و دل نشینی کے باعث ابلاغ و ترسیل کی سہولتیں زیادہ رکھتا ہے۔ غزل کا دوسرا حسن اس کی غنائیت ہے۔''

بہت ہی کم ہے تو خالِ رخِ بہاراں ہے
مری نوا کو ملی ہے وہ داغ پیرہنی
ملے جو وقت نوا سنجئی ہزاراں سے
ادھر بھی دیکھ تماشا ہے میری کم سخنی

یہ سچ ہے کہ مجروح نے بہت کم کہا تھا لیکن ان کی شاعری ''خال رخِ بہاراں سے'' آگے ہی ہے۔ دنیائے شعر و ادب کافی دنوں سے ان کی ''کم سخنی'' کا تماشا دیکھ رہی ہے۔ مجروح کا جتنا بھی انتخاب ہے وہ ''نوا سنجی ہزاراں سے'' کم نہیں ہے۔ وہ ''نوا سنجئی ہزاراں'' سے آگے نہ بھی بڑھے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کی ادبی حیثیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ ادب میں ان کا وہی مقام ہے جو فیضؔ اور فراقؔ کا ہے۔

حالیؔ نے غزل کے خلاف جس برہمی کا اظہار کیا ہے اس کی یہی وجہ تھی کہ اس زمانے میں غزل کی شاعری میں آمد کم اور آورد زیادہ تھی غزل میں عامیانہ اور سوقیانہ انداز کافی تھا۔ غزل میں عشقیہ مضامین تقلیدی طور پر باندھے جاتے تھے۔ اس لیے حالیؔ کے زمانے میں نظم کو فروغ ہوا لیکن فراقؔ نے عشقیہ شاعری کی حمایت کر کے ''غزل'' کو مزید مستحکم بنا دیا۔ ''واردات عشق'' کو روایت دے کر فراق نے غزل میں ''جنسیت'' کی اہمیت کا احساس دلایا۔ بقول فراقؔ

''عشق کا پہلا محرک محبوب کی شخصیت ہے۔ پھر یہی عشق حیات و کائنات سے ایک ایسا والہانہ لگاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ جنسیت کے حدود سے نکل کر عشق ایک ہمہ گیر حقیقت بن جاتا ہے۔''

ترقی پسند تحریک کے دوران کلیم الدین نے یہ شوشہ چھوڑا کہ غزل نیم وحشی صنف سخن ہے۔ کلیم الدین نے کوئی نئی بات پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ کلیم الدین نے وہی بات کہی جو حالی کہہ چکے تھے۔ کلیم الدین نے غالب کے اس مصرعے کا عکس پیش کرنے کی کوشش کی کہ ''بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل'' غزل کی تنگ دامانی کے باوجود غالب نے غزل کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ اپنی جودت طبع اور فکر سلیم سے غزل کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ کلیم الدین نے لایعنی بحث چھیڑ کر اردو ادب میں ہنگامہ پروری کو جنم دیا اور کچھ نہیں۔

ترقی پسند تحریک کی وجہ سے شاعری میں نعرہ بازی کو جو اہمیت خصوصی طور پر نظم میں حاصل ہوئی وہ غزل میں بیان نہیں کی جا سکتی تھی وہ غزل میں رمز و ایمائیت کے پردے میں بھی بیان کی جا سکتی ہے۔ مجروح نے یہی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جو بات نظم میں کھلے طور پر بیان کی جا رہی ہے وہ غزل میں رمز و ایمائیت کے پردے میں بھی بیان کی جا سکتی ہے۔ مجروح نے اپنی غزلوں کے ذریعے یہی ثابت کیا کہ غزل میں اتنی توانائی ہے کہ وہ ہر عہد کا ساتھ دے سکتی ہے۔ بقول محمد علی صدیقی ''روایتی شاعری کی لغت بھی نئے تقاضوں پر پورا اترتی ہے۔'' تخلیقی سطح پر روایتی الفاظ کو برت کر زندگی کی سچائی و حقیقت کو بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس میں ہم سب وقت و حالات کیساتھ برسرِ پیکار ہیں۔ مجروح نے اپنے عہد کے سیاسی و سماجی نظام کو اپنے اشعار میں بڑی چابک دستی کے ساتھ پیش کیا اور روایتی لفظوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ مجروح نے روایتی لفظوں کو نئی جہت اور تنوع عطا کیا۔ سیاسی صورت حال کو روایتی لفظوں کے استعارے میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا۔ تخلیقی سطح پر مجروح کا انفرادی تجربہ ایک نئی آن بان کے ساتھ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔

منعم کی طرح پیر مغاں پیتے ہیں وہ جام
رندوں کو بھی جس جام سے پرہیز بہت ہے
میں تو جب جانوں کہ بھر دے ساغر ہر خاص و عام
یوں تو جو آیا وہی پیر مغاں بنتا گیا

دیکھ زنداں سے پرے رنگ چمن، جوش بہار
رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ
جس ہاتھ میں ہے تیغ جفا اس کا نام لو
مجروح سے تو سائے کو قاتل کہا نہ جائے
آہی جائے گی سحر مطلع امکاں تو کھلا
نہ سہی باب قفس روزن زندان تو کھلا
ہم قفس صیاد کی رسم زباں بندی کی خیر
بے زبانوں کو بھی انداز کلام آہی گیا

مجروح اپنی ذات اور شخصیت کے اعتبار سے ایک کھرا اور بے باک انسان تھا۔ ہر فن کار کا اسلوب اس کی اپنی شخصیت اور ذات سے ہوتا ہے۔ ذات اور شخصیت کا اظہار اس کے اسلوب میں نمایاں رہتا ہے۔ مجروح کی شخصیت اور اظہار میں ایک بے باکانہ اور تیکھا انداز پاتے ہیں۔ اس لیے ہمیں ان کی شعری کائنات میں خود ترحمی اور بے بسی کی فضا نہیں ملتی۔

سر پہ ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ
ہوا اسیر کوئی ہم نوا تو دور تلک
بپاس طرز نوا ہم بھی ساتھ ساتھ چلے
ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے
چمن ہے مقتلِ نغمہ اب اور کیا کہئے
بس اک سکوت کا عالم جسے نوا کہئے

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فراز دار سے دیکھ لوں کہیں کاروان سحر نہ ہو

ہجوم دہر میں بدلی نہ ہم نے وضع خرام
گری کلاہ ہم اپنے ہی بانکپن میں رہے

ہم ہیں کعبہ، ہم ہیں بُت خانہ، ہمی ہیں کائنات
ہو سکے تو خود کو بھی اک بار سجدہ کیجئے

ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی مجروح کا نظریاتی ادراک بڑا تیز تھا۔ مجروح غزل میں مرقع سازی کے فن سے واقف تھے۔ ''شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا'' لیکن ان کی مرقع سازی میں بھی شعریت کہیں بھی مجروح نہیں ہوتی بلکہ مرصع سازی کے پردے میں اس کا حسن کچھ اور چمک جاتا ہے۔ فکر کی لالہ کاری اور زبان کی روانی تخلیقی سطح پر بڑے آب و تاب کے ساتھ ایک نئی توانائی کے ساتھ اُجاگر ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی مرقع سازی میں بھی ایک طرحداری ہے۔ ایک نغمگی ہے اور چاشنی ہے۔ وہ ترقی پسند شعراء میں خود ہی اپنی منزل کے رہبر اور راہی بن گئے۔ غزل میں ان کا اسلوب صرف انہیں تک محدود ہے۔

شمع بھی، اجالا بھی، میں ہی اپنی محفل کا
میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی، راہی بھی

تو اے بہارِ گریزاں کسی چمن میں رہے
میرے جنوں کی مہک تیرے پیرہن میں رہے

دست پرخوں کو کفِ دستِ نگاراں سمجھے
قتل گہہ تھی جسے ہم محفل یاراں سمجھے

اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو، بھنور کو چشم جانا نہ کہیں

اے رخِ زیبا بتا دے اور ابھی ہم کب تلک
تیرگی کو شمع ، تنہائی کو پروانہ کہیں
کچھ بھی دامن میں نہیں خار ملامت کے سوا
اے جنوں ہم بھی کسے کوئے بہاراں سمجھے
شب انتظار کی کشمکش میں نہ پوچھ کیسے سحر ہوئی
کبھی اک چراغ بجھا دیا ،کبھی ایک چراغ جلا دیا
مجھے سہل ہو گئیں منزلیں ، وہ ہوا کے رخ بھی بدل گئے
ترا ہاتھ ، ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے

مجروح نے جہاں روایتی لفظوں کے طلسم کو توڑا وہیں۔انہوں نے اسکے روایتی لفظوں کو نئی معنویت اور وسعت دی۔یقیناً فیضؔ کے بعد ترقی پسند شعراء میں سب سے اہم نام مجروحؔ ہی کا ہے۔مارکسی اور اشتراکی نظریئے سے ذہنی وابستگی کے باوجود مجروحؔ نے اپنے عہد کی عکاسی کی ہے۔اجتماعی شعور اور طبقاتی کشمکش وسیاسی جبریت کا اظہار فنکارانہ ڈھنگ سے کیا ہے۔انہوں نے عصری حسیّت اور صداقت کو اس انداز سے سمو دیا ہے کہ وہ جاوداں ہو گئے۔

نوا ہے جاوداں مجروح جس میں روح ساعت ہو
کہا کس نے مرا نغمہ زمانے کے چلن تک ہے
دہر میں مجروحؔ کوئی جاوداں مضموں کہاں
میں جسے چھوتا گیا وہ جاوداں بنتا گیا

مجروح کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کرامت علی کرامتؔ نے لکھا ہے۔"بیسویں صدی میں کہے گئے جتنے اشعار ضرب المثل کا درجہ اختیار کر سکے ہیں ان کی کل تعداد ۲۵، ۳۰ سے زیادہ نہیں اور مجروحؔ کے ۱/۱۲ (ڈیڑھ) شعر ۲۵، ۳۰ اشعار میں خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔مجروحؔ کو ان کے فلمی نغمے نہیں بلکہ یہی ۱/۱۲ (ڈیڑھ) شعر زندہ رکھیں گے۔

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

اور

رقص کرنا ہے تو پھر پاؤں کی زنجیر نہ دیکھ

کاش ڈاکٹر کرامت علی کرامتؔ ان ۲۵، ۳۰ اشعار کی بھی نشاندہی کر دیتے۔ ان کا یہ کہنا کی بیسویں صدی میں جتنے اشعار ضرب المثل کا درجہ اختیار کر سکے ہیں وہ صرف ۲۵، ۳۰ سے زیادہ نہیں ہیں۔ ان کی علمی زیادتی اور تنگ نظری کی دلیل ہے۔ میں اس کو کرامت علی کرامتؔ کی انتہا پسندی کے سوا کچھ نہیں کہوں گا کیونکہ ایک ذہن کا نقطہ نگاہ آفاقی یا کائناتی نہیں ہوتا۔

مجروحؔ کے یہاں صرف ۱۱/۲ (ڈیڑھ) شعر کو ضرب المثل کے صف میں کھڑا کر دینا ان کی انتہا پسندی ہے یا پھر علمی کم مائیگی کی کھلی دلیل ہے۔ جب کہ ۲۵، ۳۰ اشعار میں خود مجروحؔ کے یہاں ۵، ۷ اشعار ضرب المثل کے طور پر دیئے جاسکتے ہیں۔

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں
ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے
جو گھر کو آگ لگائے ہمارے سات چلے

روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

فسانہ جبر کا یاروں کی طرح کیوں مجروحؔ
مزہ تو جب ہے کہ جو کہئے برملا کہئے

ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح
اٹھتی ہے ہر نگاہ خریدار کی طرح

مجروحؔ سنے کون تری تلخ نوائی
گفتار عزیزاں شکر آمیز بہت ہے

ہم جب پیش رو شعراء اور ہم عصر شعراء کے کلام کو دیکھتے ہیں اور ان کے مقابل میں مجروحؔ کے اشعار دیکھتے ہیں تو ہمیں مجروحؔ کے یہاں مضامین۔خیال اور لفظیات کی یکسانیت کا شدید احساس ہوتا ہے۔کیا اس سے مجروحؔ مجروحِ سخن ہو جاتے ہیں۔کیا اس سے ان کے ادبی قد میں ایک شکن سی پڑتی ہے؟ اردو شاعری میں یہ بازگشت اور مماثلت تقریباً ہر شاعر کے یہاں دیکھی جا سکتی ہے۔خلیل الرحمٰن اعظمی نے آتشؔ کے فن پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی پتے کی بات کہی ہے۔

''غزل کے شاعر کے لئے جو کہنے کی باتیں ہیں ان میں بڑی مماثلت ہے۔ان تجربات و کیفیات کی جو ایک شاعر پر بیتتی ہیں اگر دیکھا جائے تو ان کے سچے ہونے میں کلام نہیں لیکن یہ کیفیات چوں کہ عمومی ہیں اس لئے ہر شخص کی ملکیت ہے۔ہر نیا آنے والا ان کیفیتوں کو نئی بنا دے اور اس پر اپنی چھاپ لگا دے یہ ایسا کٹھن مرحلہ ہے جسے طے کرنا آسان نہیں۔اس عمومیت میں خصوصیت پیدا کر لینا اور اجتماعی محسوسات پر اپنی انفرادیت کی مہر لگانا ہی فن کا سب سے اہم سوال ہے۔''

جنونِ دل نہ صرف اتنا کہ اک گل پیرہن تک ہے
قد و گیسو سے اپنا سلسلہ دار و رسن تک ہے

مجروحؔ

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

غالبؔ

وہ اگر بات پوچھے تو کریں کیا ہم بھی
آپ ہی روٹھتے اور آپ ہی من جاتے ہیں

مجروحؔ

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپی من گیا

قائمؔ

اب سوچتے ہیں لائیں گے تجھ سا کہاں سے ہم

مجروحؔ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

غالبؔ

روک سکتا ہمیں زندانِ بلا کیا مجروحؔ
ہم تو آواز ہیں دیوار سے چھن جاتے ہیں

مجروحؔ

موجِ آوازِ پائے یار کے ساتھ
نغمے دیوار و در سے گذرے ہیں

نامعلوم

بغل میں ہم بھی لئے اک صنم کا ہاتھ چلے

مجروحؔ

بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا

آتشؔ

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

حفیظ جونپوریؔ

راس آئے تو ہر سر پہ بہت چھاؤں گھنی ہے

مجروحؔ

میں ہی اپنی منزل کا راہبر بھی ، راہی بھی

مجروحؔ

در ما گم است جلوہ بے رہنمائے ما

غالبؔ

(ہم خود اس سفر میں اپنے رہنما ہیں ہمیں کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں)

ہم تو پائے جاناں پہ کر بھی آئے اک سجدہ
سوچتی رہی دنیا کفر ہے کہ ایماں ہے

مجروحؔ

رکھ دیئے دیر و حرم سر مارنے کے واسطے
بندگی کو بے نیاز کفر و ایماں کر دیا

اصغرؔ

ان اشعار میں اختراعی اڑان نہیں ہے تتبع کا رنگ غالب ہے مجروح نے چراغ سے چراغ جلایا اس کے بعد بھی مجروحؔ ، مجروحؔ رہے۔

کیا مجروحؔ ترقی پسند تحریک کی وجہ سے زندہ رہیں گے؟ نہیں! بلکہ وہ اپنے فن سے زندہ رہیں گے۔ ترقی پسند تحریک ادبی تحریک کا ایک تاریخی حصہ ضرور ہے لیکن فنکار کی فنکارانہ حیثیت کا انحصار اس کے اپنے فن میں زندگی کی دائمی اور ابدی قدروں کے ساتھ وابستہ رہتا ہے۔ جب تک زندگی کی یہ قدریں زندہ رہیں گی مجروحؔ کی شاعری کو بھی دوام حاصل رہے گا۔

■■■

شعور ذات کا شاعر

انجم فوقی بدایونی

(آمد: ۱۱ جنوری ۱۹۱۱ء ---------- رخصت: ۱۶ اگست ۱۹۹۵ء)

انجم فوقی بدایونی ایک جامع کمالات شخصیت ہیں۔ یہ میں نے اکثر سنا تھا اور پڑھا بھی۔ ان سے میری ملاقات نہ ہو سکی۔ لیکن ان کا مجموعہ کلام ''مہر و ماہ'' دیکھنے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ ''مہر و ماہ'' کی ورق گردانی کے بعد پتہ چلا کہ وہ اس عہد کے کتنے عظیم اور اہم شاعر ہیں۔ ان کی شخصیت ان کے شعروں میں چھپی ہوئی ہے ان کے شعروں میں جو کیفیات اور تازگی ہے وہ ان کی شخصیت کا آئینہ دار ہے۔ جس طرح ان کے شعروں میں تصنّع اور تکلف کا شائبہ نہیں گذرتا۔ اُسی طرح ان کی شخصیت تصنّع اور تکلف سے عاری ہے کچھ شعراء ایسے بھی ہیں جو وقتی شہرت کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ ان کا مزاج انہیں ان سب ہتھکنڈوں سے باز رکھتا ہے۔ وہ خاموشی سے اپنی شاعرانہ زندگی کا سفر کرتے رہتے ہیں ان میں ایک انجم فوقی صاحب بھی ہیں۔۔۔ ''جو سستی شہرت سے دور کمالِ شعر و ادب کے مقام محمود پر ایوان غزل میں تخت نشین نظر آتے ہیں۔۔۔۔''

شعوری طور پر جدید بننا ادب کے لئے بہت ہی خطرناک ہے۔ انجم نہ تو شعوری طور پر جدید ہوئے نہ بنے۔ بلکہ انہوں نے وہی لکھا جو کچھ محسوس کیا۔ کیونکہ فن کار عصری حالات سے کبھی آزاد نہیں ہوتا۔ فن کار کے اندر غم اور نشاط، امید اور مایوسی، شعور اور لاشعور، خواب اور حقیقت، خرد اور جنوں، متضاد تصوّرات چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ذات کے وسیلے سے انہیں حقائق کا اظہار فکری و فنی بصیرت کے ساتھ جسمیں جذبہ تخلیق کا عنصر زیادہ ہوتا ہے، کرتا ہے۔ یہیں سے انفرادی احساس اور لہجے کی بازیافت ہوتی ہے۔ انفرادی تجربات، مشاہدے اور مطالعے وسیع ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن جب تک ان میں جذبے کی آنچ نہ

ہو یہ تجربات اور مشاہدے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے عہد کے اعتبار سے انجم فوقی کا شعور قدیم شعری روایت سے منسلک ہونے کے باوجود عصری و جدید حسیّت سے قریب تر ہے۔

جب نظم کائنات مکمل نہ ہو سکا — بڑھ کر خدائے وقت نے آواز دی مجھے
اتنی گہری سوچ بھی کیا — ایک سے ہو جائیں دن رات
شام ڈھلے سورج کی یاد — سورج نکلے ، شام کا غم
عشق کا عالم کیا کہیئے — جیسے کوئی نیند میں ہو
شیخ بے شک خدا رسیدہ ہیں — آدمی کو مگر نہ پہچانے
محبت میں تو راتیں جاگتی ہیں — کوئی کچھ سوچ کر ہی سو گیا ہے
کوئی تم سا ملا تو سوچیں گے — ہم ابھی کیا کہیں ، خدا کیا ہے
ان کی چھاؤں سکھ کیا دے گی — جن پیڑوں کو دھوپ نہ لاگے
ایک تجلّی دو عالم — ان دونوں کا حاصل ہم

ادب نہ تو مادّی زندگی کے اثرات سے بے نیاز رہا ہے نہ رہے گا۔ جدیدیت کو جن فنکاروں نے فیشن کے طور پر برتا وہ ناکام رہے اور جو فن کار روایت سے ناواقف تھے ان کی جدیدیت محض ایک فیشن بنی رہی۔ انجم فوقی روایت سے واقف ہیں اور روایت کا اچھا خاصہ تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں ان کے یہاں جدید عناصر فطری طور سے در آئے ہیں۔ اس لئے ان کی نئی شاعری جسمیں عصری رجحانات اور نئی پرانی قدروں کا شعور بھی ملتا ہے۔ جسمیں انفرادی و اجتماعی نا آسودگی کا بھرپور اظہار ہے۔ ان کے شعروں میں حسن اور تازگی کا جاں بخش احساس رچا بسا ہے اور ہماری مسرّت میں اضافہ کرتا ہے۔ آج کا ادب داخلی کشمکش اور تضاد کا اظہار ہے۔ آج انسان متضاد عناصر کا مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ انجم فوقی نے اپنے شعور کو حال اور مستقبل کی درمیانی کڑی میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مرے شعروں میں گردش کر رہا ہے
وہ لمحہ جو ابھی آیا نہیں ہے

کچھ اور اشعار دیکھئے جن میں جدت بیانی انوکھا اظہار، تازگی اور لہجے کی سادگی ہے۔

ہردے دھرتی نم رکھتا ہوں شاید کوئی کونپل پھوٹے
پیڑ کٹے یا پتہ ٹوٹے ہنگاموں سے جان تو چھوٹے
یہ غیرت کا مول نہیں تھا گھر کے برتن باہر ٹوٹے
چھاؤں دھوپ کا میلا پن ہے کیا ہم ٹھہریں کیا ستائیں
سایہ تو ہے دھوپ کا ٹکڑا چھاؤں کہاں جو ٹھہرا جائے
آگ بھی برسے ابر بھی چھائے موسم کیا ، جو تنہا آئے
چھٹا تو کیا ہے ترے غم کا بادل برس کر کچھ اور گہرا ہو گیا ہے
جس طرف دیکھئے دکھ ہی دکھ ہے پیار کا سلسلہ بڑھ گیا ، کیا
نیند کیا خاک آتی کہ تم دُور تھے جاگتے ہی میں کچھ خواب آئے ہمیں
سایۂ تیرگی کیا لبھائے ہمیں روشنی ہو تو کچھ نیند آئے ہمیں

ان کا آخری شعر صنعتِ تضاد (Paradox) کی مثال میں بہت خوبصورت ہے۔ Paradox کی مثالیں انگریزی ادب میں جا بجا بکھری پڑی ہیں۔ خیر جانے دیجئے صرف کبیر کا ایک دوہا سُنئے جو اس وقت مجھے یاد آ گیا ہے

کبیرؔ داس کی الٹی بانی
برسے کمبل بھیجے پانی

"جدیدیت ترقی پسندی کی توسیع یا تسلسل ہے۔ وحید اختر کی اس رائے سے شمس الرحمٰن فاروقی کو اتفاق نہیں۔ وہ جن دلائل سے وحید اختر سے اختلاف کرتے ہیں وہ قابل غور ہیں۔ فاروقی کہتے ہیں۔۔۔۔ "پوری دنیا کے ادب کو سامنے رکھا جائے تو ترقی پسندی کا رجحان بہت زیادہ موثر رجحان نہیں رہا ہے اور نہ ہی اس نے ادب میں دوررس اثرات چھوڑے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ اردو میں ترقی پسندی کا چاہے جو بھی ڈنکا بجا ہو۔ لیکن مغربی ادب میں اس کو کچھ زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔۔۔۔"
فاروقی کی اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ ایسا اس لئے کہ ہندوستان میں علی گڑھ تحریک کے بعد

جوسب سے بڑی تحریک ہے وہ ''ترقی پسند'' ہی ہے۔ ہمارے ملک کے ادب کو مغربی آئینے میں دیکھنا بہتر تنقیدی رویہ نہیں ہے۔ میری رائے میں کسی بھی ملک کے ادب کو اس ملک کے جغرافیائی و تہذیبی تناظر میں پرکھنا چاہیئے۔ مغربی ادب میں اس کی کچھ اہمیت نہ ہو لیکن ہندوستان میں اس تحریک کو جو اہمیت حاصل ہے وہ سب پر عیاں ہے ظاہری بات ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ہندوستان ہی میں دُور رس اثرات چھوڑے ہیں نہ کہ مغربی ممالک میں۔ اس لئے ہندوستان میں اس کی اہمیت ضرور ہے کیونکہ جدیدیت کو ''ترقی پسندی کی توسیع یار جحان'' کہنا اس لئے بھی صحیح ہے کہ جب تک ادبی روایت کا شعور فن کار میں نہ ہو وہ زندہ نہیں رہ سکتا ویسے بھی فاروقی آدھا سچ کہنے کے عادی ہیں۔ بقول نظام صدیقی'' آدھا سچ ادب میں خطرناک ہوتا ہے۔ جو ادب میں فرقہ پرستی کو جنم دیتا ہے۔'' مزید تلخی اور ترش روئی سے کام لوں تو ظ انصاری کے الفاظ میں۔ ''ادیب اور نقاد کو تھوڑا بہت نمک حرام ہونا چاہیئے۔'' جدید ادب روایتی تنقید کے بغیر ادھورا ہے یہ سچ ہے کہ فن کار عصری حسیّت سے کبھی آزاد نہیں ہوتا۔

انجم فوقی کے یہاں انفرادی آنچ، تجربات و مشاہدے کی روشنی میں نکھرتی اور سنورتی ہے۔ ان کا جذبہ تخلیق نئی شاعری کے ادبی مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے شعروں میں فراست اور شعور کی جھلکیاں نمایاں ہیں۔ یہ کیفیت ان کے اشعار میں فن کے نقطۂ عروج پر دکھائی دیتی ہے۔

آنکھیں خاک اڑاتی ہیں — پانی ڈھونڈے ہے برسات

وہی اک شخص جو کچھ بھی نہیں تھا — مجھے اپنا کے سب کچھ ہو گیا ہے

ٹھیک نہیں ویرانی دل کی — خود ہی کوئی روگ لگا لے

جو اپنے اختیار کی حد تک خدا نہیں — وہ آدمی بھی ہو تو کسی کام کا نہیں

تجسّس کاہے کا کیا ہو گیا ہے — وہ بچھڑا کب ہے تجھ میں کھو گیا ہے

وفا میں راحتیں کیا ڈھونڈتے ہو — وفا دیوار ہے سایہ نہیں ہے

سورج کی طرح آگ میں ڈھلنا تو ہے مجھے — تم دھوپ سے ہٹ جاؤ کہ جلنا تو ہے مجھے

وہ تمہارا ہی کام ہے یارو — کارِ یزداں جسے سمجھتے ہو

اثر سایۂ دیوار ، تمہیں کیا معلوم — اہل غیرت کے لئے آگ بھی ہوسکتا ہے

زندگی ختم ، سفر باقی ہے — تجھ سے مل کر ہی یہ معلوم ہوا

راستوں میں اضافہ تو ہوگا — کوئی منزل نہیں ، پھر بھی چلئے

رُک گیا تھا خود کو منزل جان کر — اپنے اندر راستے ملنے لگے

وہ بھی تھی اپنی آواز — لاکھوں دل جو توڑ گئی

پہلے بھی یہ دودھ پھٹ چکا ہے — رشتوں میں خلوص ہی کہاں تھا

قُرب ، جب تک نہ ہو ، فاصلہ کیا — فاصلہ ، قرب کی آبرو ہے

انجم فوقی کے شعر کی تعمیر پر کوئی اعتراض تو نہیں کیا جاسکتا۔ ان کے شعری بُطون میں پوشیدہ خیال سے اتفاق واختلاف کا حق ہر کسی کو حاصل ہے۔ سید محمد تقی صاحب جن کے ادبی قد کا مجھے علم نہیں ہے۔ انھوں نے اس شعر پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے ان کے اپنے الفاظ میں سنیئے۔

اب میرے روبرو نہیں کوئی
اب مجھے آپ کی ضرورت ہے

کس قدر وسیع شعر ہے شرح کئے جایئے ، کئے جایئے ، اگرچہ یہ بات مومن نے یوں کہی ہے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

لیکن مومن کا شعر عام تاثراتی شعر ہے ، روایاتی شعر ہے انجم فوقی نے یہ کہہ کر

اب ، مرے روبرو نہیں کوئی
اب مجھے آپ کی ضرورت ہے

تصوّرات کو زبان بھی عطا کردی اور مفہوم کلام کو اس قدر بلیغ کردیا کہ خیال تخلیق اور تخلیق آدم کے مسئلے پر

بھی قرآن کے تمام اشارات انجم کے شعر میں سمٹ آئے پھر کمال یہ کہ تغزل برقرار ہے غالباً متحرک شعر اسی کو کہتے ہیں۔

مومنؔ کا شعر اپنے فطری اسلوب اور بے ساختگی کی بنیاد پر انجم فوقی کے شعر پر فوقیت رکھتا ہے تنہائی نصیب ہوتے ہی شاعر کا محبوب اس کی چشم تخیل کے سامنے آموجود ہوتا ہے جبکہ انجم کے شعر سے مترشح ہوتا ہے کہ ابھی ان کا محبوب آیا نہیں ہے۔ اور انہیں اس کے قُرب کی (چاہے وہ خیالی طور پر ہی کیوں نہ ہو) ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ کیونکہ اگر وہ آچکا ہوتا تو انہیں اس کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی (محبت کوئی ضرورت نہیں ہے)

اِس شعر کی تعریف و تحسین میں غلو اور تصرّف الفاظ کا بے جا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔ جسمیں عقیدت کی بو اس قدر تیز ہے کہ تنقیدی شعور کی مہک اپنا تاثر و اعتبار بھی کھو دیتی ہے۔ ایک غیر اہم شعر کو اس طرح پیش کرنا مشاعرے کی اناؤسنگ کے لئے بہتر تو کہلا سکتا ہے۔ لیکن ادبی نقد و نظر کے لحاظ سے چہ معنی دارد؟ تقابلِ شعر کی بات چلی ہے تو احمد شناورؔ کا یہ شعر دیکھئے۔

مجھ سے تنہائیوں میں اکثر تو
بات کرتا ہوا سا لگتا ہے

بات تصوّرات کو زبان عطا کرنے کی ہے تو احمد شناورؔ کا شعر انجم فوقیؔ کے شعر پر حاوی ہے (کچھ کم نظر حضرات ''سا لگتا ہے'' پر اعتراض کر سکتے ہیں۔ ''سا'' یہاں جیسے کہ معنی میں ہے اور ''لگتا ہے'' یعنی محسوس ہوتا ہے یا نظر آتا ہے کہ معنی میں یہاں ''سا'' کا استعمال لگتا ہے کے معنی میں نہیں ہے بلکہ جیسے کے معنی میں ہے۔) انجم کا شعر روایتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شعر میں مومنؔ نے جو تکلفات کے پردے اٹھائے ہیں وہ انجم فوقی کے شعر میں کہاں؟ تکلفات (آپ) کا پردہ اٹھ نہیں پایا (اب مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ محبت کوئی ضرورت نہیں ہے۔) بلکہ تم کا صیغہ بھی قابلِ غور ہے جس بلیغ انداز سے مومن کا شعر ہے وہ اہل نظر سمجھتے ہیں۔ انجم کے شعر میں جذبہ، تاثر اور معنی کی سطح پست ہے۔ غالبؔ جیسا انانیت پسند شاعر بھی اس شعر کی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا اور اپنا پورا دیوان اس ایک شعر پر دینے کو تیار ہو گیا۔ داد و تحسین کا انداز

بھی کوئی غالبؔ سے سیکھے۔ غالبؔ نے داد تحسین میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھی افسوس کہ سید محمد تقی صاحب کو داد دینے کا سلیقہ بھی نہ آیا۔

انجم فوقیؔ کی شاعری، ان کے شعروں کے واسطے اور شاعرانہ غلو یا تعلّی کے ذریعے جو کچھ ہم تک پہنچی ہے وہ قابل قدر ہے۔ بقول انجم، ان کی شاعری حاصل زمانہ ہے۔ شعر و سخن کے پردے میں غیبی اشارے، لفظ و معنی کی آڑ میں زمانے کی شرح اور دل کے افسانے، شعر میں کہنے کے گنہگار ہیں صاحب نقد و نظر کی پرواہ کئے بغیر انہیں اپنے ہر شعر پر اعتبار ہے۔

شاعر فطرت ہوں انجم
حرفِ آخر میری بات

کس ڈھنگ سے انہوں نے اپنی انفرادیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ویسے وہ خود ہی یہ کہنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

تم نے سوچ کے بات بڑھادی
انجم نے تو شعر کہے تھے

■■■

نئے ادب میں

احمد نسیم مینا نگری

کا فکری چہرہ

(آمد ۱۹۳۲ء ------ رخصت ۲۵ فروری ۱۹۹۱ء)

جدید شاعری نالہء دل، بوئے گل، دودِ چراغ محفل کو اپنے دامن میں سمیٹ کر زندگی کے وسیع کینواس میں کرب، تنہائی، آگہی، ذات، صحرا، دھوپ، سمندر، جزیرہ، آئینوں اور پتھروں کے درمیان ابھری غم ذات کے ادراک سے آراستہ وپیراستہ ہوئی۔عصری فکر کی شکست وریخت کے جذبات سے بے رنگ ہوئی۔ مشینی زندگی کے کرب نے اسے ''احساسِ مروت'' کی پیاس دی۔رشتوں کی خودغرض فضا سے وہ برہم ہوئی ان کیفیات زندگی کوفکری یکسانیت کا ایک ایسا موسم دیا جس میں نئے تنقیدی شعور کے ساتھ سمت بے سمت سفر میں مشغول ہوگئی۔نئی شاعری اپنے تین دہائیوں کے اختتامی سفر تک جن منفی رویوں کے ساتھ سفر کرتی رہی ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کے دامن میں کچھ مخصوص فضا، تنہائی، آگہی، ذات، سمندر وغیرہ کے ساتھ آئینہ اور پتھروں کے علامتی رنگوں میں تمام فکری شکست وریخت کے باوجود حسن نظر آتا ہے۔مگر یہ حسن روایتی شاعری کے حسن سے پھیکا بھی ہے اور کم لذت بھی اس فضا میں ہجر ووصال کے گیت نہیں ابھرے بلکہ سناٹوں کے لبوں سے گہری چیخیں ہی سامنے آئیں۔نیا ذہن نئی شاعری میں پوری طرح ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔اس کے اظہار میں عصری رجحانات کی آمیزش بھی ہے اور ایک ہلکی سی بغاوت بھی۔نیا فنکار، وہ بغاوت اپنی ذات کے ذریعے کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اس بغاوت میں کسی انقلاب کی گونج نہیں ہے بلکہ یہ بغاوت آج کے ماحول سے غیر یقینیت، غضبناکی، خود اجنبیت اور تنہائی زندگی کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔تین دہائیوں کے نئے تخلیقی موسم کی فضا میں ایسے فنکار ابھرے ہیں جنہوں نے اپنے متوازن فکری سفر سے قبول عام کی شہرت حاصل کی ایسی

معتبر آوازوں میں احمد نسیم مینانگری کی آواز بھی شامل ہے۔ بڑے ناموں کے ساتھ نہ سہی ان سے دور رہ کر بھی اس آواز کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اینگلس نے Miss Harkness کو ایک مکتوب میں لکھا تھا جس میں سیاسی خیالات وافکار کے اظہار پر اسطرح رائے دی ہے۔ ''کسی مصنف کی سیاسی آرزوئیں جسطرح پردۂ اخفاء میں رہتی ہیں اسی قدر فن پارے کے حق میں بہتر ہوتا ہے۔''

اس قول کی روشنی میں ترقی پسند شعراء نے خطیبانہ انداز اور خارجیت کو نظر میں رکھا لیکن وہ اس داخلی کرب کو نہیں پا سکے اور وہ انسانی نفسیات کی گہری گتھیوں کو سلجھانے میں ناکام رہے۔ نئی شاعری نے اپنے ''عصر'' کو پہچانا لیکن یہاں بھی بعض شعراء ناکام رہے۔ کیونکہ سیاسی بصیرت اور فکر کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ ان کے فکری چہرے پر بدہضمی کا گہرا اثر رہا کچے پکے خیالات میں ڈوبی ہوئی مطالعے کی شاعری تکرار کی گونج بن کر رہ گئی۔ (یہی حال جدید شاعری کا بھی رہا ہے ان کے یہاں بھی تکرار کی گونج سنائی دیتی ہے۔) فکری یکسانیت کے احساس کا تجزیہ کیا جائے گا تو مذکورہ بالا باتوں کی آسانی سے تصدیق ہو جائے گی۔ اس تصدیق کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہیکہ اس سے مطالعے کی افادیت کو مجروح کیا جائے بلکہ مطالعے کے ''تحلیلِ نفسی'' کے پہلو کو اجاگر کرنے کی ضرورت کی طرف اشارہ کرنا تھا۔ اس گہرے لطیف تنقیدی احساس اور اینگلس کے قولِ صادق پر احمد نسیم مینانگری کے سیاسی شعور کی شعری کاوشیں نئی شاعری کی فضا میں پوری طرح اترتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

ادب، جدید رویّوں کی بھٹّی میں پوری طرح تپا نہیں پچھلے عہد کا ادب تپا زیادہ مگر زندگی اور کائنات کی حقیقی لذتوں سے ہمکنار نہیں ہوا قوتِ متخیلہ کو مطالعۂ حیات وکائنات کی حقیقی لذتوں کا وسیع موقعہ نہیں ملا جسکی وجہ سے کھلا علامتی رویّہ پرانی شاعری کا وصف امتیازی رہا۔ ادب کو حیات کی تفسیر یا ادب کو زندگی کا ایک ایسا آئینہ قرار دیا گیا ہے جو زندگی اور اپنے ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے مخصوص سیاسی، معاشرتی، سماجی حالات سے مربوط رہتا ہے۔

انسان اور کائنات کا رشتہ عقلی فلسفوں سے بس اتنا ظاہر ہوتا ہیکہ دونوں ایک حادثہ ہیں اور حادثے کی تقدیریں لئے ہوئے گردشوں میں گم ہیں۔ گردشِ کائنات کی وسعتوں میں یہ انسان بھی اپنی زمینی گردش کا شکار ہے عقلی فلسفوں کے ساتھ ساتھ کچھ روحانی نظریوں نے بھی انسانی زندگی کو رہنمائی دی

ہے یہ رہنمائی ہر عہد میں انسانوں کو ملی ہے اور ہر عہد میں انسان نے اس کو زندگی کے لئے سرمایۂ حیات بنایا ہے۔

نئی شاعری کے سفر میں ان دونوں نظریوں کی لطیف آنچ محسوس ہوتی ہے۔ شروع شروع میں نئے ذہن کے منہ زور نقادوں نے دونوں نظریوں کا کھلا مذاق اڑایا اور انسانی سماج سے ان کی آدرشی (مثالی) وابستگی کو مذاق قرار دیا جب ان نقادوں کو اور گہری نظر حاصل ہوئی اور تجزیاتی ذہن اونچا اٹھا تو ان کی لامعنویت خود ایک مقصد کے روپ میں ان کو نظر آئی تب انہیں احساس ہوا کہ انسان زندگی کے کسی بھی حصے میں بغیر کسی نظریئے کے سانس نہیں لے سکتا وہ ذہن وفکر کو بھی کبھی خالی نہیں رکھ سکتا۔

غیر ممکن ہے ملے قید تعیّن سے نجات
دیر جب یاد نہ آیا تو حرم یاد آیا

عارف عباسی

احمد نسیم مینانگری بھی شروع ہی سے ایک روحانی نظریئے کے ساتھ چلتے رہے ''شعور حیات'' ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں علامہ اقبال کی فطری قربت کھلے طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری سے وہ متاثر ضرور رہے مگر وہ مرعوبیت کا شکار نہیں ہوئے یہی وجہ ہیکہ شعور حیات کی شاعری میں ان کی انفرادیت باقی رہی نظموں کے ساتھ ساتھ غزل کے سفر میں بھی ان کا اپنا ایک مزاج تھا۔ اور اسلوب اور لہجے سے جہاں تک شاعر کے اپنے نظریئے کا تعلق ہے وہ نظریہ آج بھی غزلوں میں رچا بسا ہوا ہے زخموں کے پیرہن سے لیکر ''خاک رنگ'' تک ان کا نظریہ لطیف سے لطیف تر انداز میں شعروں میں اترتا رہا ہے۔

عشق نے دیکھ لئے دونوں جہاں کے جلوے — اور ابھی اہلِ خرد شمس وقمر تک پہنچے
یہ کیسی پیاس کا عالم دکھائی دیتا ہے — کہ آج بحر بھی شبنم دکھائی دیتا ہے
یہ کائنات عجب آئینہ ہے اسمیں مجھے — اک اقتدار کسی کا دکھائی دیتا ہے

مشتعل تھی جہاں پتھروں کی اَنا
اس طرف ضد مری آئینہ لے گئی

دل کو سورنگ دکھاتا ہے تصور ان کا
جب سے تنہا ہے عجب انجمن آرائی ہے

اجالا درد کا پھیلا ہوا تھا راہوں میں
جدھر سے اہلِ تمنّا کا قافلہ نکلا

جب ہوس خونِ محبت سے جلاتی ہے چراغ
ڈوب جاتے ہیں اندھیروں میں اجالے کتنے

احاطہ کر گئی سورج کا شبنم
سمٹ کر کس قدر پھیلا ہے پانی

بے سایا ہو گئے تھے ہماری طرح شجر
دانستہ ہم بھی بن گئے پت جھڑ کے ہمسفر

آنکھوں کے فاصلے ہی تھے جو طے نہ ہو سکے
ورنہ وہاں سے دُور نہ تھی دل کی رہگذر

ہم نے بھی راہ شوق میں کاٹی ہے فصل غم
زخموں کا پیرہن ہے ہمارے بھی جسم پر

چشمے ہیں پتھروں کے جگر میں چھپے ہوئے
دیکھا ہے ہم نے سخت چٹانوں کو توڑ کر

ہوا کے پیچھے کبھی بھاگتا نہیں جگنو
اندھیری راہ میں وہ روشنی لٹاتا ہے

وجود ان کا بظاہر کُھلا نہ ہم پہ کہیں
سفر میں زیست کے وہ ذات ساتھ ساتھ رہی

مٹی کا جسم روح پہ اک بوجھ بن گیا
کچے مکان سے مجھے باہر نکال دے

جنوں ہر مرحلے سے باخبر ہو کے گذرتا ہے
خرد کے حوصلے تلوار سے آگے نہیں جاتے

احمد نسیم مینانگری اپنی عام زندگی میں ایک کھُلے سیاسی ذہن کے مالک اور سیاسی فکر ونظر رکھنے کے باوجود اپنی شاعری کو خصوصاً سیاسی آرزوؤں کو پردۂ اخفا میں پیش کرتے ہیں۔ ہر حساس فن کار کے یہاں سیاسی وسماجی شعور اور بیداری کو اس کے اپنے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔

احمد نسیم مینانگری کا فکری سفر طویل ہے۔ انہوں نے مقصدی اور نظریاتی لہجوں کا عہد بھی دیکھا ہے گو وہ عصری تبدیلیوں کو تمام تر قبول نہیں کر سکے تو اس کی وجہ ان کا اپنا تنقیدی ذہن تھا اس بات کا اعتراف ضرور کیا جا سکتا ہے دونوں بڑے عصر میں میانہ روی کے ساتھ چلتے رہے جہاں تک ان کی پرانی شاعری میں ان کے نظریات کی گہری گونج سُنائی دیتی ہے انہی نئی آوازوں میں ان کی آواز دھیمے پن کے ساتھ ان کی شخصیت کے خدوخال سے جُٹی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ صرف ان کا ہی حال نہیں ہے نئے موسم کی

دھوپ چھاؤں میں ایسے بہت سے پیش رو شاعر ہیں جو نئی آوازوں میں کھوئے نہیں بلکہ نئی آوازوں میں استحکام کا ذریعہ بھی بنے اور اپنی انفرادیت کو برقرار بھی رکھا۔ نئی ہواؤں کے ساتھ چلنے والے ایسے فن کاروں کی فہرست میں بھی بعض نام ایسے ہیں جن کی فکری روش عام زندگی کے ہنگاموں میں سطحی رہی جو تخلیقی گہرائیوں اور فنی تب و تاب تک نہیں پہنچ سکی جس کی وجہ سے لطیف جذبات کی جگہ کرخت لہجوں کی فضا سامنے آئی۔ ہر خام مواد ادب میں جگہ نہیں پاتا اس لئے وہ نام جن کے فکری رویئے فن کے لطیف رنگوں کو نہیں چھو سکے ابھی تک ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ اس کے برعکس جب کوئی فن کار عصری رجحانات اور نئی لفظیات کے ساتھ فنی بصیرتوں سے ہم آہنگ ہوتا ہے اور اپنے فنی اظہار میں منفرد انداز کے ساتھ چلتا ہوا دکھائی دیتا ہے تو اس کی فکری کاوشیں اپنے قاری کو متوجہ کرتی ہیں اور فن کار کو اس فہرست سے علیحدہ کرتی ہیں تا کہ بدلتے ہوئے فنی رویوں سے وہ پوری طرح باخبر رہے۔

احمد نسیم کی شاعری خواہ وہ نظمیہ ہو کہ غزلیہ اپنے نظریات کو ایک کامل فن کار کی طرح کھلے پن کی راہ نہیں دیتی سیاسی تفکرات اور تجربات کی سختی کو وہ بڑی نرم روی سے قبول کرتے ہیں اور تخلیقی عمل میں اسی انداز سے لوٹاتے ہیں۔ کیونکہ ہر بڑی شاعری کا چہرہ علامتی ہوتا ہے اور علامتوں کے سہارے آگے بڑھتی ہے نہ کہ خطیبانہ یا واعظانہ اندازِ فکر میں یا ڈانٹ ڈپٹ کے لہجے میں ترقی پسند شعراء داخلیت کے گہرے فنی احساس کے ساتھ اپنے سیاسی نظریئے کو علامتی آنچ نہ دے سکے جسکی وجہ سے کھلے اظہار کا رویہ سامنے آیا ان کا رویہ چند بنیادی ضرورتوں کا ترجمان اور پروپیگنڈے کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ چند داخلی رخ رکھنے والے بڑے فن کاروں نے ہر چند خارجیت سے دامن بچانے کی سعی کی۔ مگر وہ بھی پروپیگنڈے کی زد میں آکر گہری داخلیت میں نہیں اُتر سکے۔ (سوائے فیضؔ، مجروحؔ، جذبیؔ وغیرہ کے) احمد نسیم کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں جو عمیق داخلیت کے ساتھ ان کے سیاسی شعور اور سیاسی بصیرت کو اُجاگر کرتے ہیں اور ان کے مندرجہ ذیل اشعار کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں داخلیت و خارجیت میں حد امتیاز نظر نہیں آتی ہے مگر ان میں معنویت کی کئی سطحیں ابھر آتی ہیں۔

جلتے گھروں کا دیدۂ تر میں شمار لکھ　　خون جگر سے قصۂ غم بار بار لکھ
پیاسے ہیں دشت غم میں سرابوں کے قافلے　　صحرا کے نام بھی کوئی ابر بہار لکھ
ہر شمع زندگی کی طرف ہے ہوا کا رُخ　　ہر روشنی کے جسم پہ کالا لباس ہے
رات صحرا کی آگ پی تو گئی　　کتنے سورج مگر اگلتی رہی
گھر سے کوچہ ، کوچہ سے بازار تلک　　اک انساں ہے لیکن کتنے چہروں میں

نہیں ہے ربط کوئی آئینوں کی بستی میں　　ہے بے نیاز بہت چہرۂ ہنر میرا
وہ بھیڑ تھی کہ خود سے تعارف نہ ہوسکا　　چہروں کا اک ہجوم مری ذات ہی میں تھا
لہو سے سرخرو ہم نے کیا ہے اپنے شعروں کو　　وگرنہ زندگی کے رنگ کاغذ پر نہیں ملتے

داخلی احساس جب فنی اور تخلیقی فورس تک ساری کیفیتوں کو پہنچا دیتا ہے تو لفظوں کے جسم میں حرارت پیدا ہوتی ہے اور پھر ہر لفظ ترتیب سے شعری پیراہن میں آجاتا ہے ایسا ہی نظام ہمیں احمد نسیم کے شعروں میں نظر آتا ہے۔

لفظوں کے پتھروں میں کٹی اپنی ایک عمر
آئے ہیں تب نگاہ میں آزر خیال کے

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک سیاسی ذہن رکھنے والا شاعر کس قدر شاعری میں گہری داخلیت کے ساتھ آگے بڑھنے کی جستجو میں لگا ہوا تھا اور خصوصاً اوپر دیئے گئے اشعار میں آخری شعر جو خارجی داخلیت کی واضح مثال ہے۔ انسانی زندگی سے کتنا قریب ہے "گو ہم سب اپنے اندر کئی زندہ کردار رکھتے ہیں لیکن ان میں کوئی بھی چہرہ ایک دوسرے کا حریف نہیں بلکہ ایک دوسرے سے ہر ایک کا ربط خاص ہے۔"

ایمرجنسی کے خاتمے کے بعد احمد نسیم نے جو غزل کہی ہے وہ پوری غزل ان کے سیاسی خیالات کی بھرپور ترجمان ہے۔ ہر شعر جس لطیف پیرائے سے سامنے آتا ہے پڑھنے والوں کو شعری لذّت سے آشنا کراتا ہے۔

برف پگھلی تو سارے پرندے اڑے　　رنگ جیسے بکھر کر دھنک کے اڑے
آئینہ بن گئے جن کی خواہش پہ ہم　　رنگ ان کے ہی چہروں کے پہلے اڑے

جب خزاں نے اتارا شجر کا لباس　　کتنی غیرت سے شاخوں کے پتّے اڑے
زندگی کے سفر کا عجب رنگ تھا　　ایسا لگتا ہے بس چند لمحے اڑے
دشت سے کوئی چشمہ نہ پھوٹا نسیم　　پیاسے ہم بھی سرابوں کے پیچھے اڑے

اردو غزل کا طویل سفر داخلی اور خارجی وارداتوں سے بھرا پڑا ہے غزل کے شعروں میں لطیف کیفیات خواہ وہ خارجی ماحول کی دین ہوں یا وارداتِ قلبی کا نتیجہ ہوں دونوں کیفیات کا اثر یکساں ہوتا ہے خارجی احساسات صحیح اور مناسب لفظوں میں اتر آتے ہیں تو وجدان کو سرشار کر جاتے ہیں۔ اسی طرح داخلی احساس کا اظہار بھی مناسب لفظوں کا محتاج ہوتا ہے جس قدر لفظوں کے بڑھنے کا عمل صحیح ہوتا ہے شاعری اتنی ہی متاثر کن ہوتی ہے۔ بعض حالتوں میں فن کار کے تخلیقی رویّوں میں اظہار کے وسیلے کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اسلئے شعروں کی فضا بہت کھلی ہوئی ملتی اور کبھی کبھی ترسیل کی ناکامی کا بھی شکار ہو جاتی ہے۔

داخلیت اور خارجیت فن غزل میں بظاہر دو الگ الگ کیفیات ضرور ہیں مگر غزل کے وسیع مزاج کو اگر صحیح طور پر سمجھا جائے تو یہ دونوں حدیں ایک مقام پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ بات ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے نئی غزل کے مندرجہ ذیل شعروں کا حوالہ دیتے ہوئے اپنے جائزے میں اس طرح کہی ہے۔

رین اندھیری ہے اور کنارہ دور　　چاند نکلے تو پار اُتر جائیں
دھیان کی سیڑھیوں پہ پچھلے پہر　　کوئی چپکے سے پاؤں دھرتا ہے

ناصر کاظمی

چلا ہے مجھ سے آگے میرا سایہ　　سو میں بھی ساتھ چلتا جا رہا ہوں
یہ چاہا تھا کہ پتھر بن کے جی لوں　　سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

سلیم احمد

چہروں کی دھند بجھنے لگی شام سے ظفرؔ　　رنگ ہوائے شام کچھ ایسا ہی زرد تھا

ظفر اقبال

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتّہ دکھائی دیتا ہے

فصیل جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدود وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی

شکیب جلالی

ایک مدت سے چراغوں کی طرح جلتی ہیں
ان ترستی ہوئی آنکھوں کو بجھادے کوئی

ساقی

تنہائی کی یہ کونسی منزل ہے رفیقو
تا حد نظر ایک بیابان سا کیوں ہے

شہریار

اب شکایت ہے کہ راتیں چیختی ہیں
آج تک کیوں شہر والے بے خبر تھے

شمیم حنفی

اوپر جو مثالیں دی گئی ہیں ان سے اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں کہ نئی غزل انسانی زندگی اور ماحول کے رشتوں اور رابطوں کو بالکل نئے انداز میں دیکھتی ہے اس غزل میں داخلیت اور خارجیت کی حدیں ختم ہو گئی ہیں اور شعر میں معنی کی کئی سطحیں ابھرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ان اشعار میں قافیوں کی رعایت سے پرانے مضامین یا عشق و عاشقی کی کیفیات کو لفظی الٹ پھیر کے ساتھ دوہرانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے ان میں وہی کیفیتیں ہیں جن سے آج کا شاعر دوچار ہے اور ان کے اندر سایوں اور دھندلکوں کی وہی آویزش ہے جو آج کے انسان کا مقدّر ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کی رائے کو سامنے رکھتے ہوئے میں یہ بات اور وثوق سے کہتا ہوں کہ گہرا فنی احساس خارجی اور داخلی کیفیات کو لفظوں کے وسیلے سے تخلیقی اظہار دیتا ہے تو شعر بول اٹھتے ہیں یہ بھی حقیقت ہے کہ کچی فکروں سے شعروں میں بہت کھلا پن آجاتا ہے جو غزل کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو پایا۔یہ کھلا اظہار غزل کے حسن کو مجروح کرتا ہے۔زندگی کے جھیلے ہوئے رنج و غم نشاطِ مسرّت کے گہرے اور ہلکے اثرات قبول کرنے کا انحصار شاعر کی اپنی فکری حس سے ہوتا ہے جتنا ذہنی اور قلبی تاثر بھرپور ہوتا ہے واردات کی ترجمانی بھی اتنی ہی موثر ہوتی ہے۔انسانی زندگی کا ہر عکس خارجی ہے مگر جب

یہ عکس دل کے ''دردسوز'' میں ڈوبتا ہے تو آئینہ بن جاتا ہے۔

آئینہ اپنی تجلّی ہی سے آئینہ ہے　　راز کی بات کریں آؤ اشارات کے ساتھ

قابل ادیبی

آئینہ کی یہ تجلی راز کی بات یعنی (علامات) اور مشاہدات یعنی (تشبیہ واستعارہ) کی راہیں کھولتی ہے ان راہوں پر چلنے والا فن کار زندگی کے بکھرے ہوئے مسائل کو چنتا ہے اور انہیں جذب کرتا ہے۔ جذب کا یہ عمل فن کار کی فکر وفن کی ضمانت بن جاتا ہے۔

جدید شاعری نے اپنے ''عصر'' کو پہچانا لیکن زندگی کو چھونے کی جستجو میں ایسی ٹھوکریں کھائیں جو تجربوں کے نام سے باقی رہ گئیں۔ شاعری کے لطیف احساسات فیصلوں کے لئے نہیں ہوتے بلکہ ادراک اور عرفان کے ان گہرے مشاہدوں کی ترجمانی کے لئے ہوتے ہیں۔ جن سے بصیرت کا لہو ٹپکتا ہے اور یہ لہو بصیرت کے احوال کو زندگی کے وسیع تجربوں میں مشغول کر دیتا ہے۔ یہ ''مشغولیت'' عرفان و آگہی کے دریا بہاتی ہے اور فنی ادراک کے ساتھ فن کو اس کے اظہار کیلئے سب کچھ دیتی ہے۔

نئی شاعری ہر چند اپنے ''عصر'' کی نباض ہے مگر نباضی میں وہ رنگ نہیں ہے جو زندگی اور کائنات کے ہمہ گیر گوشوں کو سمیٹنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے باوجود جہاں تک نئے ذہن نے نئی شاعری میں جو کچھ سمیٹا ہے وہ قابل قدر ہے اور غنیمت بھی ایسے نازک عصری حسّیت کے دور میں احمد نسیم نے جہاں وسیع ذہن کے ساتھ اپنی شاعری میں وہ کھلی سیاسی شخصیت کی حیثیت سے بھی اپنے تخلیقی ذہن میں موجود ہے۔

اردو شاعری میں نظریاتی یا غیر نظریاتی رجحانات کی کشمکش پر بہت کچھ لکھا گیا ہے جہاں تک تنقیدی اظہار کا تعلق ہے غزل کی شاعری میں حسرت موہانی پہلے عظیم فن کار ہیں جنہوں نے سیاسی ذہن کی گرم گفتار کیفیتوں کو غزل کے لطیف مزاج میں اتارا ہے۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی　　اک طرفہ تماشہ ہے حسرت کی طبیعت بھی

انہی کے عہد میں ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر بھی موجود تھے لیکن وہ مولانا حسرت موہانی کی لطیف کیفیات تک اپنی شاعری کو نہیں پہنچا سکے ان کی شاعرانہ عظمت اور بصیرتوں سے انکار نہیں غزل

میں غزل کے مزاج کا لحاظ اگر کسی نے رکھا تو وہ حسرت موہانی ہی تھے۔ جو عملی زندگی میں جنگ آزادی کی سیاسی اذیتوں، قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا رہے۔ ان کی شاعری ان کے عہد کی غزل کی زبان میں بہت خوبصورت ہے ان خوبصورت گوشوں پر اردو ادب کے نقادوں نے پوری توجہ کے ساتھ بہت کچھ لکھا ہے مگر نئی شاعری کے عصر میں ایسے کم شاعر ہیں جن کے فکری گوشوں میں سیاسی آنچ تو ہے مگر ان پر ہمارے نقادوں نے قصداً یا سہواً نظر نہیں ڈالی۔ اس بے اعتنائی کے باوجود بھی یہ گوشہ توجہ طلب ہے اس اعتبار سے نئی شاعری کے معتدل رفتار احمد نسیم مینا نگری میرے لئے قابل توجہ ہیں کہ ان کی شاعری میں سیاسی آنچ بڑے غیر محسوس انداز سے لطیف پیرایہ میں سامنے آئی ہے۔

آواز دے رہی تھی مجھے اپنی زندگی
اک جنگ دوسروں کے لئے لڑ رہا تھا میں

موسم گل میں ہوئی ہیں کیوں لہو کی بارشیں
باغ کے اندر عنادل کے ہیں پر بکھرے ہوئے

افسردگی زمیں کی بڑھنے لگی نسیم
سورج کی روشنی میں سبزہ اداس ہے

مجرم ہیں اپنے شہر میں یوں تو سبھی نسیم
چہرے نہیں ہیں سب کے گنہگار کی طرح

بس اتنی بات پہ برہم ہے شب کی تاریکی
ہماری چشم میں سورج کا کوئی خواب ہے کیوں

موسم نئی حیات کا کب آئے گا ادھر
بجھتی نہیں سراب سے ہونٹوں کی تشنگی

مانگتے کسی سے شعور زندگی کی بھیک ہم
جہل کے سورج اندھیروں میں درخشندہ رہے

احمد نسیم کا مخصوص شعری مزاج اگر چہ خالص سیاسی نہیں ہے ان کے یہاں مختلف النوع شعری تجربات مل جاتے ہیں جو زندگی اور کائنات کے اہم گوشوں کی ترجمانی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

جگنو بھی کوئی رات کے منظر میں نہیں تھا
یہ خواب بھی آنکھوں کے مقدر میں نہیں تھا

سورج تھا سلگتا ہوا اک بوند کے اندر
شبنم کا جگر گہرے سمندر میں نہیں تھا

اس واسطے بد نام رہے شہر میں اپنے
چڑھتے ہوئے سورج کے طرفدار نہیں ہیں

سورج کسے دکھاتے یہاں سب تھے کور چشم
ہم ہی نسیم راہ سے اندھوں کی ہٹ گئے

زخموں کی نئی فصل سے شاداب ہمیں تھے
سبزوں کی طرح دھوپ میں سیراب ہمیں تھے

ٹوٹے گا کچھ ہی دیر میں خوابوں کا طلسم
سمجھے ہیں جس کو زیست کہانی ہے رات کی

قدم کے اٹھتے ہی جیسے زمین تھم سی گئی
ہمارے ساتھ مگر آسمان چلنے لگا

زرد پتّے تو خود ہی ٹوٹیں گے
کھو نہ یوں اپنا اعتبار ہوا

ہے معصوم ہاتھوں کا یہ حادثہ
کہ بچوں نے کاٹے ہیں تتلی کے پر

آسودہ ہو گیا ہے بدن زخم زخم سے
دشمن کا ہر سلوک ہے محبوب کی طرح

جی چاہے کہ اک بیج سے بن جائیں شجر ہم
پت جھڑ کی ہواؤں سے مگر ڈر بھی لگے ہے

دھوپ میں چلتا ہے اپنے ساتھ جو
اجنبی سا ایک سایا ، کون ہے

زندگی کیسے اندھیروں سے ہمیں لائی ہے
اپنا ہی چہرہ اجالے میں سیہ کار لگے

لگتے ہی ثمر آئے گا پتھراؤ کا موسم
قسمت میں شجر کے یہی آزار لکھا ہے

سایا نہ دے سکی کوئی دیوار شہر کی
بیگانگی کی دھوپ میں شدت وہی رہی

قطرے میں آب کے ہیں کئی آسماں چھپے
شبنم کی کائنات میں سورج ٹٹولیے

بجھتی ہے کب سراب کے دریا سے تشنگی
سورج کی پیاس دیکھ کے صحرا اداس ہے

تختیاں ناموں کی اب کون یہاں پڑھتا ہے
سب ہیں ہمسائے سے بیگانہ یہاں بستی میں

سوچ کے کاغذ ہیں سادہ آؤ کچھ ان پر لکھیں
ہم نے جو دیکھے ہیں اپنے شہر کے منظر لکھیں

جانے کس آنکھ سے ٹپکی تھی کسی پتھر پر
بوند خاموش تھی اک گہرے سمندر جیسی

زخموں کا سارا کرب خیالات ہی میں تھا
سرسبز یہ درخت مری ذات ہی میں تھا

میرؔ کی طرح احمد نسیم کے یہاں بھی غموں کا ادراک گہرا ہے میرؔ کو جس طرح ہمسائے کے درد و کرب کا احساس بے چین کرتا رہا ہے اسی طرح احمد نسیم کو شہر کے جلتے منظروں میں وہی درد و کرب کا احساس ملا۔ وہ کہتے ہیں ''ہم نے جو دیکھے ہیں اپنے شہر کے منظر لکھیں'' جو دیکھے ہیں ٹکڑے میں وہی افسردگی ہے جو میرؔ کے یہاں دکھائی دیتی ہے کہ ''تو ہمسایا کاہے کو سوتا رہے گا۔''

لہجے سے اب ہمیں بھی یہاں جانتے ہیں لوگ
ہم ہیں نسیم ، میر کے اسلوب کی طرح

بقول سلیم شہزاد۔

''یہ شاعرانہ تعلّی احمد نسیم کا اپنے فن پر اعتماد کا اظہار اور ساتھ ہی ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی آئینہ دار بھی ہے اور مختلف خانوں میں بٹی ہوئی یہ شخصیت اپنے ہر رنگ میں میر کے اسلوب کی طرح ہے۔'' لیکن وہ جاں سوزی کا عالم جسے میر کی زبان میں ''کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں'' کسی جدید شاعر کے یہاں نہیں ملتا جو میر کو نصیب ہوا اس ''جاں سوزی'' کی جھلک کچھ فن کاروں میں تھوڑی بہت دکھائی دیتی ہے۔ جسکی وجہ سے ان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ میر سے قریب ہو گئے ہیں یہ احساس بھی کسی فن کار کیلئے نعمت سے کم نہیں اگر چہ جدید شعراء میں ''جاں سوزی'' پیدا ہوتی تو نئی شاعری کا روپ کچھ اور ہی ہوتا۔ جدید شعراء کو ققنس کی طرح جینا ہوگا وہ اپنی آگ میں جل کر امر ہو جاتا ہے۔ احمد نسیم کا شعر ہے۔

شاعری میں ہے ہماری بھی وہی جاں سوزی
میر کے زخموں کا احوال سنانے والے

انکی شاعری اذیتوں کے سفر کی ایک کہانی ہے اور وہ کہانی خیالی نہیں ہے ان کا سفر نامہ اسی زندگی سے شروع ہوتا ہے جہاں سروں پر آتشیں سورج ہے جہاں زخموں کی تاب ہے جہاں ریت ریت سمندروں کا خواب ہے۔ جہاں پتھر کے بدن ہیں جہاں لہو ''زرخواب'' بن کر ٹپک جاتا ہے جہاں صلیبوں کے نگر ہیں جہان تشنگی خواب کی شکایت ہے اور کہیں دریاؤں سے شکوہ ہے تو کہیں آوارہ سرابوں سے کچھ کہنے کی خواہش ہے کہیں دھنک کے منظر بھی ہیں اور وہ منظر جو ڈوبتے رنگوں کا عکاس ہیں۔ اسمیں

لہو سے ریت کے دریا پہ آب لکھ دینے کا حوصلہ تو ملتا ہے مگر خونِ جگر دولیعت مژگان یار کے مصداق ایک ایک قطرے کا حساب دینا باقی رہ جاتا ہے۔

تاہم ان کی شاعری زندگی سے قریب بھی ہے اور سیاسی بصیرت کا آئینہ بھی اور ان کی اپنی شخصیت کا پرتو بھی احمد نسیم اپنے عہد سے بے نیاز نہیں ہیں۔ وہ اپنے عہد کی ایک ایک بات کو لفظ میں اسیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں

تمام عمر کا اپنا حساب لکھ دوں گا
جو سانس سانس رہا اضطراب لکھ دوں گا
اگر میں آگیا بچ کر سراب صحرا سے
لہو سے ریت کے دریا پہ آب لکھ دوں گا
یہ عہد کوئی کہانی نہیں کہ سنتا رہوں
اذیتوں کے سفر کی کتاب لکھ دوں گا
سروں پہ آئے گا جب بھی یہ آتشیں سورج
میں ریت ریت سمندر کا خواب لکھ دوں گا

■■■

''خاک رنگ'' کا شاعر

احمد نسیمؔ مینا نگری

(آمد : ۱۹۳۲ء ------ رخصت : ۲۵فروری ۱۹۹۱ء)

آج مالیگاؤں شہر جو ''سفید وان'' کو اوڑھے ہوئے دکھائی دیتا ہے وہ احمد نسیم مینا نگری کا مرہون منت ہے شروع میں شہر کے بنکروں نے دلچسپی نہیں دکھائی لیکن دھیرے دھیرے وہ بنکروں کو بیدار کرنے میں کامیاب ہوئے۔شہری صنعتی ترقی کو ایک رُخ دے کر وہ ہٹ گئے مگر اس راہ پہ چلنے والے آج بھی کامیاب و کامراں ہیں احمد نسیم مینا نگری کے انتقال پر عبدالمجید سرور اپنے اداریئے میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہے۔

"نسیم صاحب کا دل بھی عشق سے زندہ ھے انسان سے محبت ، دوست و احباب سے محبت، خویش و اقارب سے محبت ، علم و ادب سے محبت ، صحافت و سیاست سے محبت یہ اس کے زندگی کے ھزاررنگ اور ھزار پھلو تھے۔ نسیم نے ان سے محبت کی تھی وہ کیسے مر سکتا ھے ۔ ھر محبت کے سینے پر اس کی یادوں کے نقوش ثبت ھیں۔"

احمد نسیم کی صحافت سیاست اور ادبی بصیرت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔سیاست ان کے نزدیک بذات خود اپنے مزاج میں نہ نوری ہے نہ ناری۔سیاست بری نہیں ہم برے ہیں۔ مطلع ،ثبات، پسینہ اخبار نکالے،ان اخبار کے مطالعوں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے وہ صحت مند صحافت کیلئے کوشاں رہے بقول فضیل جعفری۔

''ان کی شخصیت روایتی تہذیب وشرافت کا ایک پیش قیمت نمونہ تھی بہ حیثیت شاعر وہ بہت مشہور نہ سہی لیکن خاصے معروف تھے برصغیر کے ادبی حلقوں میں ان کا نام ایک جانا پہچانا نام تھا۔ان کا کلام اکثر و

بیشتر معیاری رسائل کی زینت ہوا کرتا تھا۔''

احمد نسیم کی بصیرت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے ان کی شاعری کا روایتی سفر فکر و تجسس سے لبریز ہے اس پہلو کو واضح کرنے کیلئے ان کی غزلوں کے چند اشعار سے استنباط کیا جاسکتا ہے۔

دنیا میں خودکشی تو نہیں درد کا علاج
پروانے جل کے شمع پہ کیوں خاک ہو گئے

عزم بے باک کو دبتے ہوئے دیکھا کس نے
جل کے بھی خاک اڑا کرتی ہے پروانوں کی

نسیم میں ہوں چراغِ سحری کا پروانہ
مجھے قضا کے اشارے فریب دیتے ہیں

مہلتِ زیست بس اتنی ہے سحر ہونے تک
پھول مرجھا گئے دامن پہ نظر ہونے تک

زباں سے حرف صداقت نکل گیا ہو گا
زمانہ ہم سے جو برہم دکھائی دیتا ہے

وہ ساتھ لے کے گیا جیسے حسن گلیوں کا
وہی ہے شہر مگر دوسرا لگے ہے مجھے

چشم تر کی روانی سے جلتے رہے
جن کو جلنا تھا پانی سے جلتے رہے

صورت شمع ہم بھی تری بزم میں
مدتوں بے زبانی سے جلتے رہے

اکیلا سچ کی طرح جب سے میں نکلنے لگا
تمام شہر کو میرا وجود کھلنے لگا

احمد نسیم نے ''شعور حیات'' سے ''خاک رنگ'' کا ایک طویل سفر طے کیا ہے ان کا آخری شعری مجموعہ ''خاک رنگ'' کی شاعری پر اظہار خیال کی ادنیٰ سی کوشش کر رہا ہوں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

"یہ کائنات ایک سریلا جھرنا ھے اور انسان اس کی آواز۔"

ویسے بھی میرے نزدیک ''آواز'' بذات خود ایک کائنات ہے۔ شاعر دل کی دھڑکنوں کو زبان عطا کرتا ہے۔ وہ کائنات کی روح سے ہم کلام ہوتا ہے اور ہم کلامی کا یہ احساس اسے ایک سرور بخشتا ہے جس میں اس کا سفر بقول آل احمد سرور ''مسرت سے بصیرت تک کا ہوتا ہے۔'' اس کا یہ سفر کبھی پس حجاب ہوتا ہے یا پھر اندرونِ ذات سے ہوتا ہے بہر حال فن کار اپنے تخلیقی سفر میں اپنی تخلیقی قوتوں سے حسن کی مرقع کشی کرتا ہے جسے J. B. Priestley نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''کوئی شاعر صحیح معنوں میں قنوطی نہیں ہوتا ہر شاعر صاحبِ تخیل ہوتا ہے کم سے کم وہ اپنے تخیل پر

چاہے ہمارے خیال میں کتنا ہی سقیم کیوں نہ ہو وہ ایمان رکھتا ہے اور اس کو خیر و برکت کا سرچشمہ سمجھتا ہے۔ ہر فن کار حسن کا قائل ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ موجودہ زندگی میں سرے سے اس عالمِ آب و گل میں اس کو یہ حسن نہیں نظر آتا ہو لیکن کسی نہ کسی عالم میں وہ حسن کو تسلیم کئے ہوئے ہوتا ہے ورنہ وہ فن کار نہیں ہو سکتا۔"

اس کلیئے کی روشنی میں خاک رنگ کی شاعری میں موت کا اظہار ایک ایسی حقیقت بن کر ابھرتا ہے جسمیں زندگی کا حسن بھی پوشیدہ ہے۔ "خاک رنگ" شاعر کا ایک ایسا وصیت نامہ ہے جسمیں موت ایک ناگزیر حقیقت ہے اس وصیت میں بندہ کی خدا کے سامنے عاجزی وانکساری کو بھی دیکھا جا سکتا ہے عنصری قوت اور ملکوتی شعور سے شاعر نظموں اور غزلوں میں مخصوص خفیف ارتعاش پیدا کرتا ہے۔

"موت" زندگی کی ایک ایسی بشارت ہے جو اپنی عظمت کے باوجود ان کے دل میں انبساطی لہر کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ شاید اس کی وجہ ان کا ملکوتی شعور ہے جسمیں ان کو اپنی آشفتگی وانتشار اور بکھرنے کا غم تھا۔ "لہو سے ستارے ٹوٹے ہیں" کے عنوان سے احمد نسیم نے خود لکھا ہے۔

"ہم زندگی کو خوبصورت سمجھتے ہیں مگر اس خوبصورتی میں حالات بھی خوبصورت ہوں ایسا کم ہوتا ہے نامعتبر سانسوں سے چہکنے اور مہکنے والی یہ زندگی پھر بھی ہم کو عزیز ہے گلوں سا مہکنے والا بچپن، خوش رنگیوں میں ڈوبی ہوئی جوانی اور شام کے سورج کی طرح خودکشی کرتا ہوا بڑھاپا ہمارے سفر زندگی کی یہ منزلیں ہیں ان منزلوں میں زندگی سب کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کرتی اس کے ہم بھی شہید ہیں۔ اس نے ہمیں بے رنگیوں میں ڈوبا ہوا بچپن دیا، جوانی افسردہ حال کٹی، زندگی کی شام تو پھر شام ہے۔ جو دونوں پہروں سے زیادہ اذیّت ناک ملی۔"

کہا جاتا ہے کہ شہر خموشاں کا سناٹا اپنے سکوت میں زندگی کے فانی ہونے کا سبق چیخ چیخ کر دیتا ہے اس چیخ کو ان کی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے اس چیخ میں کرب ہے نوحہ خوانی نہیں ہے اپنی آشفتگی و انتشار اور بکھرنے کے غم کو وہ اپنی نظموں میں یوں پیش کرتے ہیں بقول عبدالمجید سرور۔

"حمد" کے عنوان سے جو نظم شامل کی گئی ہے۔ وہ ایک ایسے انسان کے خیالات کی ترجمانی کرتی ہے جو حالات سے لڑتے لڑتے زندگی کا پُر پیچ اور کڑا سفر کرتے کرتے تھک گیا ہو اور کہہ رہا ہے۔

خدا وندا !

ترے کون و مکاں میں
کمی تھی کون سی
جس کے لئے
خلد بریں سے
مجھے نیچے اُتارا
ترے جنت کے اک کالے شجر کے پھل کو چکھا
گناہ کا ذائقہ
اک مصلحت تھا
ترا منشا
کڑی ہجرت کی صورت
میرا پہلا سفر تھا۔

انسان کی دوبارہ پیدائش و نمود پر ''مٹی'' ایک عمدہ نظم ہے۔

'' مٹّی ''

مٹی کا یہ اپنا پن
کتنا اچھا ہے
سانسیں جب رک جاتی ہیں
مٹی کا یہ جسم ہمارا
مٹی میں مل جاتا ہے
روح ہماری انجانی فضا میں
کھو جاتی ہے

اک وعدے پر ہم کو یقیں ہے
اسی مٹی سے پیدا ہوئے
اسی مٹی میں مل جائیں گے
روزِ آخر پھر آئے گا
''کن فیکون'' کی تیز صدا سے
روح کا خالق
مٹی کے جسموں کو
پہلی صورت دے کے
جگائے گا
ہم سے زیادہ مٹی اس کو پیاری ہے۔

اقبال نے زندگی کو جلال و جمال کے آئینے میں رکھ کر انسان کی خودی اور عشق کو اجاگر کیا ہے غالب نے شوخی و ظرافت کے پردے میں انسان کو کاغذی پیرہن سے تشبیہ دے کر ''شوخی تحریر'' سے تعبیر کیا ہے اور فانی نے اپنی بصیرتِ کلامی سے موت کو زندگی کے ہی مترادف گردانا ہے لیکن احمد نسیم مینا نگری نے اداسی اور زندگی کو اُس کی حقیقت کے تناظر میں دیکھا اور ''موت'' کو کسی فلسفیانہ نقطۂ نظر سے نہیں دیکھا بلکہ زندگی کے رشتے موت کے ظالم پنجوں سے کس طرح ٹوٹتے ہیں اور اس کے وارثین اور متعلقین پر کیا اثرات مرتب کرتے ہیں اس کی حقیقت کو جوں کا توں رکھ دیا ہے زندگی کے چہرہ بہ چہرہ بدلتے ہوئے رجحانات کو اس کی حقیقت کے ساتھ روشناس کرایا موت اور اداسی یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کھرا اظہار ان کی ''خاک رنگ'' کی شاعری میں نمایاں ہے جسے کسی بھی طرح دیکھئے واضح اور صاف نظر آئے گا۔

سانسوں کے رشتے ٹوٹنے سے ''پیوند خاک'' ہونے کے بعد اس کے وارثین اور احباب شاعر کے ''شہرت'' و کردار کے ساتھ کیا عوامل درپیش ہوتے ہیں اس کا الف اظہار ''خاک رنگ'' کی نظمیہ و غزلیہ شاعری میں جگہ جگہ نمایاں ہے۔

"شہرت"

جنازہ اٹھے گا
اک شور کی فضاؤں میں
کچھ آنسوؤں کی رُتیں
اپنے ساتھ آئیں گی
زمیں کے سینے میں
ہم کو اتارا جائے گا
ذرا سی دیر میں
پھر لوگ لوٹ جائیں گے
عدم کے شہر کا سناٹا
ہم کو کھائے گا
ہمارے نام کی خوشبو ہوا میں پھیلے گی
ہماری یاد کا موسم رہے گا بستی میں
صلہ بغیر جیے
کچھ نہ ملا سانسوں کو
ہمارے نام
خوابوں میں جاگتے ہوں گے
قلم کے رنگ
خیالوں میں جاگتے ہوں گے
سکوتِ شہرِ خموشاں میں اور کیا ہوگا؟
ہمارے نام کی تختی لگائی جائے گی

ہماری قبر پر
شہرت کو خاک چاٹے گی

اس نظم میں روحانی وجدان کے ذریعے موت کی حقیقت کا کشف ایک وسیع تجربے کے ساتھ در آتا ہے شاعر موت کی حقیقت سے آشنا ہونے کے بعد موت کا افسوس کرتا نظر نہیں آتا ہے بلکہ وہ اس کو بخوشی قبول کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ موت کی حقیقت سے فرار کا راستہ نہیں ڈھونڈتا بلکہ وہ اس کی حقیقت کو جان لینے کے بعد بھی راضی بہ رضا نظر آتا ہے اور وہ اسکی سچی حقیقت سے حوصلہ شکن ہونے کی بجائے اسے قبول کرنے کا پیغام دیتا ہے۔

''لمحۂ اذیت''

اجل کا جسم کو چکھنا ہے ذائقہ اک دن
اجل کی سوچ کے لمحوں سے کیوں ہراساں ہو
اجل کا وقت مقرر ہے یوں سبھی کیلئے
ہر اک کو جانا ہے اس لمحۂ اذیت تک
سب کی ایک ہی منزل ہے
سبھی کے ساتھ ہیں
آزار بے ثباتی کے

ان نظموں میں ملکوتی شعور سے ''موت'' کے ادراک کا اظہار خوبصورت ہے لیکن حکیمانہ انداز فکر نہین ہے موت کا اظہار ذہنی ونفسیاتی اظہار ہے۔ انسان کی مجبوری و بے بسی کا اظہار ہے جسمیں ہلکا سا جبر کا اشارہ بھی موجود ہے۔ نظم ''مٹی'' میں انسانی فطرت کی مجبوری کو بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے کہ بقیہ نظموں میں بھی موت سے زیست کا تابناک پہلو ابھر کر سامنے نہیں آتا لیکن ہاں اس تابناک

پہلو میں ''موت'' کی سچائی ابھر کر سامنے ضرور آتی ہے۔ زندگی کی راہوں میں جہاں پھول ہیں وہیں کانٹے بھی اسکے ساتھ رہتے ہیں۔اسی کشمکش کے درمیان انسان عالم آب وگل میں رہ کر موت کو ایک اٹل حقیقت گردانتا ہے۔اس میں شک نہیں ہے کہ ان نظموں میں حیات وکائنات کے بے ثباتی کا کربناک غم بھی شامل ہے۔''پیاس'' کے عنوان سے جو نظم لکھی گئی ہے وہ بہت خوبصورت ہے اس عہد میں ہر فرد بے اطمینانی کی زندگی گذار رہا ہے تذبذب اور انتشار کی گہری فضا ہمارا عہد لئے ہوئے ہے اس فضا میں فن کار کی حالت اور بھی نازک ہو جاتی ہے وہ اپنے محسوسات اور افکار کا اظہار اس صورت میں کرتا ہے۔

عطا کا ذکر
کب ممکن ہے مجھ سے
مجھے سب کچھ دیا
اس زندگی میں
فقط پہچان سے محروم رکھا

بعض نظموں کا اختتام افسانوی انداز سے ہمارے سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے تاثر دوگنا ہو جاتا ہے قاری ایک ایسے احساس سے دوچار ہوتا ہے جس میں زندگی کی حقیقت کو احساس کے آئینے میں ڈرامائی تاثر کے ساتھ پیش کیا ہے ان کے اختتام کے ٹکڑے اردو ادب کے اچھے افسانوں پر فوقیت رکھتے ہیں مثلاً ان کی نظمیں ''احساس ،مٹّی ،ایک سوال،گمنامی ، اک حادثہ'' وغیرہ

انہوں نے لکھا ہے کہ۔۔۔۔۔۔کبھی کبھی نظم (یا غزل) کا اظہار لذّت سے خالی بھی ہوتا ہے یہ لذّت کا خالی پن تخلیقی اُکساؤ کا نقص نہیں ہے عصری بے رنگیوں کی شدّت کا نتیجہ ہے۔۔۔۔۔۔''

لیکن میری رائے یہ ہے کہ عصری بے رنگیوں کی شدّت تو ہر بڑے فن کار کے ساتھ رہی ہے اگر ان کے کلام تخلیقی لذّت سے خالی ہیں تو یہ انکے اندر کے چھپے ہوئے فن کار کا نقص ہے نہ کہ تخلیقی اُکساؤ کا۔۔۔۔۔

احمد نسیم نے اپنی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔

''۔۔۔۔۔میری شاعری کا لہجہ افسردہ ضرور ہے مگر میری افسردگی زندگی کی طرح مہکتی ہے عام ذہنوں سے گفتگو بھی کرتی ہے۔۔۔۔''

جدید شاعری ایک عرصے تک ''مگس کی قے'' معلوم ہوتی رہی ہے۔''مگس کی قے''، ہر چند اپنا افادی پہلو رکھتی ہے مگر اس کی کراہیت سے کون انکار کر سکتا ہے اس پر فن کار کو بھی سوچنا چاہیئے۔''تخلیقی قے'' جسے میں ''مغز کی قے'' سے تعبیر کرتا ہوں مطالعے کے ہضم نہ کرنے کی وجہ سے ہے یا پھر اپنے آپ کو نمایاں کرنا فن کار کا مقصود ہوتا ہے۔لطیف رنگوں کی فضا کو چھوڑ کر کرخت لہجوں کی فضا اپنانا کہاں کی دانشمندی ہے۔

لفظوں کے ہر صدف کو نزاکت سے کھولئے
آواز بے اثر نہ ہو آہستہ بولئے

آیئے احمد نسیم مینانگری عام ذہنوں سے گفتگو کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

رقیب چپ ہیں، نئے جال بن رہے ہوں گے
کپاس میلے خیالوں کی چُن رہے ہوں گے
یونہی نہیں کوئی جلتا حسد کی آتش میں
نظر میں کچھ تو ہمارے بھی گن رہے ہوں گے
لکھوں گا خون جگر سے میں حال کاغذ پر
جئیں گے مجھ سے زیادہ خیال کاغذ پر
ہر ایک شئے ہے یہاں کاغذی لباسوں میں
اسی ملال میں روئے خیال کاغذ پر
جو چپ رہیں تو زباں کانپتی ہے اندر سے
جو سچ کہیں تو دریدہ دہن کہا جائے
ملال اس لئے گہرا ہے اس کے جانے کا
کہ ایسے شخص کو آتے زمانے لگتے ہیں

شاعرانہ حواس وادراک کے ساتھ ''موت'' کا انکشاف بھی غزلوں میں نئی فضا اور نئی فکر اور نئے لہجوں کی گونج کے ساتھ ہے۔

خواہشیں روز جگاتا ہے کیوں فانی مجھ میں
کون کرتا ہے میرے خون کو پانی مجھ میں
ڈور کی طرح جو سانسوں کو کترتا ہے میری
تیز رو کوئی تو احساس ہے فانی مجھ میں
کونپل جیسی نازک سانسیں کاٹنے والا کون ہے یہ
اندر باہر خوف کے لمحے بانٹنے والا کون ہے یہ
مٹی کے جسموں کے اندر کس کا ہے احساس چھپا
انجانی آوازیں لگا کر ڈانٹنے والا کون ہے یہ
میں خوش تھا بہت کاغذی پوشاک پہن کر
اک خواب ہوا دیکھ یہاں خاک پہن کر
اے کاش کہ کٹتا نہ تجلّی سے میں اسکی
پچھتایا بہت پیرہن خاک پہن کر

''خاک رنگ'' کی نظمیں اور غزلیہ شاعری ایک مخصوص مزاج و کیفیات کی ترجمان ضرور ہیں۔ موت کی سچائیوں کے اظہار کے باوجود اس کا کینواس وسیع نہیں ہے لیکن موضوعات میں تنوع ہے۔ ''خاک رنگ'' کی شاعری کی اکہری فضا نے شاعر کی انفرادیت کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے گو وہ ایک مخصوص فکر کے ساتھ محدود ضرور ہے جسمیں لطیف کیفیات و اشارات سے اپنے مافی الضمیر کو شاعر نے بیداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ''چند ثلاثی'' جو قمر اقبال کی نذر کئے تھے ملاحظہ فرمایئے کہ۔۔۔۔

چند قطرے اتار دیتا ہے
پیاسی سیپوں میں ابر نیساں بھی
پھر سمندر کا پیار دیتا ہے

وقت ہر شخص کا بدلتا ہے
غم نہ کر بے کسی کے لمحوں کا
رات ڈھلتی ہے دن نکلتا ہے

تار ریشم کے بُنتا رہتا ہے
جانفشانی سے کیڑا ریشم کا
اپنے فن کی کہانی کہتا ہے

زندگی کس کا ساتھ دیتی ہے
کر نہ اس خوبرو پہ ناز بہت
سب کو رستے میں لوٹ لیتی ہے

گل اذیّت کے ساتھ کھلتا ہے
غم چھپاتا ہے اپنے رنگوں میں
چند لمحے تو ہنس کے ملتا ہے

شہد سارا ہوس کے ہاتھ لگا
کچھ نہ آیا مگس کے حصّے میں
''موم کا شہر'' اپنے ہاتھ لگا

ساری بستی مہکنے لگتی ہے
زخم کے پھول جب بھی ہنستے ہیں
زندگی بھی چہکنے لگتی ہے

تتلیاں ، خواب کی اڑاتا جا
دھوپ ہے زندگی کے گلشن میں
رنگ احساس کے لٹاتا جا

خاک رنگ کے مطالعے سے ہم پہ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کو اپنی حیات کا شعوری ادراک ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی ''زخموں کے پیرہن سے ''زر خواب'' دیکھتی ہوئی ''خاک رنگ'' ہوا چاہتی ہے۔ احمد نسیم کا آخری شعری سفر اسی ایقان کا سچا پیمان ہے۔

■■■

مقیم اثر بیاولی

شخص و شاعر

چند اشارے

کوئی تو وصف ہوگا اسمیں زاہد مخالف اس کا آخر شہر کیوں ہے

صابر زاہد

مقیم اثر پر جب پہلا مضمون لکھا تو کسی نے کہا۔ یہ کافر کب سے مسلمان ہو گیا، میں نے از راہ ظرافت جواب دیا اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے ابھی اور بھی بہت سارے لوگوں کا مشرف بہ اسلام ہونا باقی ہے۔

ادبی حلقوں میں سوال اٹھایا گیا کہ۔۔۔۔۔ کیا واقعی مقیم اثر بڑا شاعر ہے۔ وہ تو اتنا بڑا شاعر نہیں جتنا مضمون نگاروں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مقیم کی شاعری پر مضمون کیا لکھا کچھ فن کاروں کی بھنویں تن گئیں۔ کچھ نے فقرے کسے کہ تمہارا ادبی مطالعہ کیا ہے؟ اور تمہاری ادبی حیثیت کیا ہے؟ کچھ شعراء کو مقیم اثر سے ذاتی عناد نہیں ہے بلکہ مقیم اثر کی متکبرانہ باتوں سے کد ہے وغیرہ وغیرہ۔ کسی کو مضمون حوالوں سے بھرا نظر آیا۔۔۔ کسی نے تعریف کی۔۔۔ کسی نے تضحیک۔۔۔۔۔

مقیم اثر کو قریب سے دیکھا۔۔۔ دُور سے سُنا۔۔۔ مگر وہی اندازِ بے نیازانہ۔۔۔ تازہ غزل ہوئی تو سنانے پر آمادہ۔۔۔ سخن شناسی بھی ایسی کہ ایرے غیرے کو غزلیں نہیں سناتا۔۔ لیکن کبھی کبھی سنا بھی دیتا۔۔۔ کہو میرے بھائی غزل کیسی رہی۔۔۔ فکری اٹھان کیسی ہے۔۔۔۔۔ بظاہر داد سے بے نیاز نظر آتا ہے۔۔۔ لیکن داد کا طالب دل کی نگاہوں سے چاہئے جانے کا خواہش مند۔۔۔ زود گوئی ایسی کہ۔۔۔ رفتار و معیار قائم نہ رکھتے ہوئے شعر کہتا ہے اپنے کلام کا عارف۔۔۔۔۔ ساتھ ہی

ساتھ کلاسیکی فن پاروں میں بھی دُور رس نگاہ رکھتا ہے۔ بحث پر آمادہ۔۔۔ ہمیشہ اپنے آپ کو لئے دیئے رہنا۔۔۔ ترنگ میں ہو تو اوروں کے شعر پر خوب دل کھول کر داد دیتا ہے۔ اس کے محاسن پر بھی روشنی ڈالتا ہے ورنہ اچھے شعروں کی بھی مٹی پلید کرتا نظر آتا ہے۔

مزاج ۔۔۔۔۔ کبھی شعلہ۔۔۔۔۔ کبھی شبنم۔۔۔ کہیں ظرف آتش وظرف ناسخ کا مرکب ہے عالم غضب میں اپنے مصاحبین پر جارحانہ وار کرتے ہوئے نہیں چوکتا۔۔۔ اس کی علمی وادبی حیثیت کو برسرِ محفل چیلنج (Challenge) کر کے اپنے کسی شعر کی فی الفور تشریح کی دعوت دیتا ہے۔۔۔ مگر ہاں جو تشریح یا تفسیر وہ بیان کرتا ہے بھلے ہی وہ شعر اس کا متحمل نہ ہو۔۔۔ یعنی پھر وہی بات آجاتی ہے کہ سارا کمال انداز بیان یا ندرت بیان کا۔۔۔ یعنی ضروری نہیں کہ ہر شعر میں یہ معیار برقرار رہے۔ خیال کتنا ہی اچھا ہو اگر بیان میں غرابت آجائے تو اظہار کا رنگ پھیکا ہو جاتا ہے۔۔۔ یعنی ترسیل کی ناکامی کا المیہ۔۔۔ مفہوم اونچا اظہار پھیکا ہو جاتا ہے۔ جب اچانک تشریح کی دعوت دیتا ہے تو گویا اس کے نزدیک مصاحبین کی علمی حیثیت مشتبہ۔۔۔۔۔ ویسے بھی شخصی طور پر وہ اپنے کلام پر سخت تنقید برداشت کرنے کا یارا نہیں رکھتا۔

مقیم اثر اپنے اندر جلال و جمال کی صفت رکھتا ہے اسمیں ایک خود اعتمادی و خدا اعتمادی بھی ہے ایک امنگ ہے ایک لہر ہے لوگ اس لہر سے خوفزدہ بھی ہیں پاس آنے کو ڈرتے بھی ہیں دُور سے اس کی شخصیت اس کی شاعری کے بارے میں اچھی بری رائے بھی رکھتے ہیں۔ اشعار کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے۔ شعراء اس کی علمیت کے جتنے قائل ہیں اتنا ہی اس کے مزاج سے بدگماں بھی۔۔۔۔ اس کی انانیت وخود اعتمادی اور شخصیت کو سمجھنے کے لئے وجدؔ کے اس شعر کا عرفان ضروری ہے۔

خاکساری کو چھپانے کیلئے وجدؔ مغرور نظر آتا ہے

گفتگو کا انداز کبھی نرم کبھی تلخ وترش۔۔۔ لہجہ میں کرختگی۔۔۔۔ آواز میں بلند آہنگی ۔۔۔ جتنی کاوش شاعری میں کرتا ہے اتنی ہی کاوش شعر سنانے میں کرتا ہے۔۔۔ کبھی کبھی نرم مصرعے کو بھی بلند آہنگی سے سناتا ہے جس کا اتنا تقاضہ نہیں ہوتا۔۔۔ اچھے بھلے نرم ونازک مصرعے بھی اس کے

لب پر آ کر پناہ مانگنے لگتے ہیں۔شعر سناتے وقت انداز داد طلب بھی ہوتا ہے۔۔۔۔۔تعبیر طلب بھی تفسیر طلب بھی۔۔۔۔خود ہی شعر کی تفسیر بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اب بتا۔۔۔۔۔کسے شعر سناؤں ۔۔۔۔ادبی کنجڑوں کو شعر سناؤں۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

ایمرجنسی میں ایک نظم ''بوڑھی قیادت'' کے عنوان سے لکھی۔نظم لکھنے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔۔۔۔۔۲۱ روز جیل کی ہوا کھائی۔۔۔۔ریمانڈ ہوا۔۔۔۔۔صعوبتیں جھیلیں۔۔۔۔۔پوچھا گیا۔۔۔۔آپ کے ساتھی کون ہیں۔۔۔۔کہا۔۔۔۔پورا ہندوستان۔۔۔۔انسپکٹر نے کہا۔۔۔۔چالاک معلوم ہوتے ہو ۔۔۔۔۔جواب سے خوش ہوا۔۔۔۔ایسے نازک لمحوں میں دوست واحباب کو بچائے رکھنا اس کا شیوہ رہا۔۔۔۔۔جب کہ ایسے نازک موقعے پر اپنے پرائے سبھوں نے آنکھیں پھیر لی تھیں۔۔۔۔علیک سلیک کرنے سے بھی لوگ کتراتے تھے۔۹ مہینے تک Suspend رہا جنتا حکومت میں دوبارہ نوکری پر بحال کر دیا گیا۔دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔۔۔اعتراف میں کہا گیا۔۔۔۔چار لاکھ کی آبادی میں صرف ایک مرد ہے وہ ہے مقیم اثر بیاولی۔۔۔۔کچھ اس قسم کا خراج۔۔۔۔سابق منسٹر نہال صاحب کی طرف سے پیش کیا گیا۔

مقیم اثر کی محفل میں گفتگو کا مزا اس وقت کچھ اور سوا ہو جاتا ہے جب اسے چٹکی لیکر جھنجھوڑا جائے پھر ردّ عمل کے طور پر ایسے معنی اپنے شعر کے بیان کرتا ہے کہ ہم سن کر یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا　　لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

نامساعد حالات میں وہ اپنے حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے زندگی کے حالات وحادثات سے لڑتا رہا مسکراتا رہا کہتے ہیں مصیبت میں سایا بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے اس لئے اسے اپنوں سے شکایت نہ گلہ ۔۔۔۔بس زندگی کی ایک تلخ حقیقت تھی جو اس کے سینے میں ناسور بن کر رستی رہی۔۔۔۔۔خاموشی سے تنہا حالات سے لڑتا رہا جس کی قیمت چکانی پڑی۔۔۔۔۔دوستوں سے دوستی نبھائی۔۔۔۔۔دشمنوں سے بھی دوستی نبھائی۔احباب کے لئے سب کچھ لٹانے کو تیار۔۔۔۔انجام سے بے پرواہ۔۔۔۔بس خلوص ہی خلوص۔۔۔۔شکستِ دل کے باوجود بھی جینے کا حوصلہ موجزن۔۔۔۔شعراء۔۔۔۔مقیم سے

بہ حیثیت شخص ہونے کے نفرت کرتے ہیں ۔۔۔ مگر اپنے ضمیر کا محاسبہ کون کرے ۔۔۔ وجود حق کو گواہ رکھ کر خود اپنی ذات سے پُرسش کون کرے آیا وہ باطن میں کسی کا محبّ کسی کا غمگسار ۔۔۔ کسی کا جاں نثار ہے بھی یا نہیں ۔۔۔ کیونکہ شعلہ بن کر جینا اور ہے مشتِ گل بن کر جینا اور ۔۔۔۔

اس کا قد درمیانہ، بدن کسا ہوا اور گھٹا ہوا ہے پیشانی کشادہ اور آنکھیں روشن اور عقابی ۔۔۔۔ اس کی آنکھوں سے کبھی علمیت ٹپکتی ہے تو کبھی غرور ۔۔۔۔ اور کبھی خاکساری ۔۔۔ اس کی گفتگو میں کسی قسم کی منافقت نہیں پائی جاتی ۔۔۔ گفتگو بے ریا ۔۔۔۔ لاگ لپٹ سے پاک ۔۔۔۔ جو دل میں وہی زبان پر ہے ۔۔۔ جو زبان پر ہے وہی دل میں ہے ۔۔۔ اس کی شخصیت میں کوئی تضاد نہیں ۔۔۔ بس اس شعر کے مصداق۔

مری انا میرے دشمن کو تازیانہ ہے　　اسی چراغ سے روشن غریب خانہ ہے

اسد بدایونی

لباس سادہ ۔۔۔۔ کرتا پائجامہ ۔۔۔ فیاضی میں درویش صفت رئیس زادہ طبعیت میں وہی قلندرانہ انداز ۔۔۔ مکر وریا سے پاک وصاف ۔۔۔ جو اس کی زندگی کا خود ایک دل آویز پہلو ہے ۔۔۔ دورانِ گفتگو کبھی شعر وشاعری پر سیر حاصل تبصرہ ۔۔۔ کبھی اس کا موضوع میرؔ وغالبؔ یا پھر خود اسکی اپنی ذات شریف ۔۔۔۔ اپنے کلام کی گرہیں کھولنے لگتا ہے ۔۔۔ لہجہ وہی کبھی تلخ وترش کبھی ملائم وشیریں ۔۔۔۔ اس کی گفتگو میں تندی وتلخی ضرور ہے۔ اس تلخ وترش حقیقت سے اس کے دل کا غبار الفاظ کی شکل میں نمودار ہوتا ہے جسمیں دریا کی سی روانی ہوتی ہے گفتگو تکلف سے عاری ہوتی ہے گفتگو میں کہیں صداقت ہوتی ہے ۔۔۔ کہیں حقیقت سے فرار کا اظہار ۔۔۔ گفتگو کے درمیان موٹی موٹی گالیاں بے تکان وبے تکلّف دینے لگتا ہے ۔۔۔ کبھی وہ بندۂ نا امید تو کہیں بندۂ بے نیاز نظر آتا ہے گفتگو کا انداز کبھی تنقیدی ۔۔۔ کبھی تنقیصی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے ویسے بھی خود اعتمادی اور خود پرستی میں بڑا فرق ہوتا ہے وہ اپنی تند کلامی اور دریدہ دہنی کو باعث صد افتخار سمجھتا ہے ۔۔۔ اپنی تند کلامی اور دریدہ دہنی کو دلیل اور وقار کے آئینے میں پیش کرتا ہے ۔۔۔ مگر اوروں کے نزدیک صرف تند کلامی ۔۔۔

صرف دریدہ دہنی رہتی ہے۔۔۔اپنے کلام کا خود عارف ہے اس لئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا بقول حافظ

شرح مجموعہ گل مرغِ سحر داند وبس کہ ہر کو ورقے خواند و معانی دانست ۔

زندگی کے ہر محاذ پر خود سے برسرِ پیکار رہا ہے تازہ زخموں کے گلابوں سے چمن میں پھول کھلاتا رہا اور خوشیوں کو ہوا کے ساتھ پھیلاتا رہا۔۔۔۔دل کے داغوں کو تخم سرو چراغاں کہہ کر زخم سہہ جاتا اور وہ بھی ضبط کے ساتھ خود اس کی اپنی زندگی پر کسی احسان سے کم نہیں ہے۔۔۔غنیمت ہے لہو کی ہم نوائی کے عنوان سے ایک تحریر میرے سپرد کی تھی۔

''ہوا کی مخالفت پیڑوں کو ثبات بخشتی ہے دشمن سے دوست کی خواہش، حوصلے کی پسپائی کی دلیل ہے دریا کی طرح اپنے راستے کی کٹھنائی سے الجھ کر اپنا راستہ خود پیدا کرے ذرّہ حوصلے کی سپر تھامے، پہاڑ رائی میں بدل جاتا ہے۔قطرہ بحر سے نبرد آزمائی پر اُتر آئے تو سمندر اپنی ذات میں سمٹنے لگتا ہے خوشبو کے پیروں میں ہوا، زنجیر ڈال کر خود بھی اسیر خوشبو ہو جاتی ہے۔۔۔''

یہ اقتباس خود اس کے داخلی کرب خود کلامی کا مظہر ہے اس میں شہر کے ادبی حلقوں کی شاعرانہ چشمک اور ادبی بد دیانتی و ادبی استحصال کا احساس واضح نظر آتا ہے شہر کا پورا ادبی حلقہ اس سے بدظن ہے اس کی اپنی شخصیت کی وجہ سے۔۔۔ نہ کہ سخن (شاعری) سے۔۔۔اس کا وہ خود بھی ذمّے دار ہے ۔۔۔کوئی خوش ہے کوئی ناخوش۔۔۔مزاج کا سخت۔۔۔اس کی عذر فطرت مجبور کی عکاسی ہے اس شہر میں اس کی مخالفت بھی ہوئی۔۔۔یہ مخالفت بہتان طرازی اور ذاتی زندگی کے نگار خانوں تک پہنچنے پر بھی دم نہیں لیتی۔۔۔نجی گفتگو نازک خیالیاں، عصبیت، خوّد داری اور بلند ہمتی کی مظہر ہے وہ جان بوجھ کر دھوکا کھاتا ہے۔۔۔ویسے وہ فطرتاً دھوکا پسند ہے اس کی مزاجی کیفیت و شخصیت سے ہم کو کتنا ہی اختلاف ہو لیکن اس کی ادبی گفتگو میں جو کشش پائی جاتی ہے اس کا مزہ قریب سے بیٹھ کر سننے میں ملتا ہے ۔۔۔ضروری نہیں کہ وہ ہر ایک کو اپنی طرف کھینچ سکے۔۔۔موٹی موٹی گالیوں کے پس منظر میں لوگ اس کی ''انا'' کو نہیں سمجھ سکے اس کی ''انا'' کو معراج انکساری کے پردے میں دیکھا اور تولا جا سکتا ہے۔یہ الگ بات ہیکہ اہل زبان گالیوں سے اجتناب برتتے ہیں۔

وہ جیسا ہے ویسا ہی نظر آتا ہے جیسے کوئی قلندر اپنی گفتگو کو بے نیازانہ طریقے سے جنوں کے اظہار میں پیش کر رہا ہے۔

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

غزلیں سناتے وقت والہانہ خود سپردگی اور جذبات کے شدید اظہار کی کیفیت گالیوں کے ساتھ حد سے زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے گفتگو میں کبھی کبھی نہ ضبط و شائستگی نہ ٹھہراؤ۔۔۔۔۔خوش گوار سنجیدگی بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے کہیں کہیں برقرار بھی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔پھر بھی ان سب کی پرواہ کئے بغیر شاعری کا سفر تا حال جاری ہے جسمیں اس کی شخصیت اور کلام کو دیکھا جا سکتا ہے۔

یا اتنا سخت جان کہ تلوار بے اثر　　یا اتنا نرم دل کہ رگ گل سے کٹ گیا

شکیبؔ جلالی

مقیم سے ادبی نوک جھونک کئی بار ہوئی اور اس نے اپنی اضطراری کیفیت کا اظہار یوں کیا ہے کہ" ارشد نظر کی منفی سوچ میرے وجود کو اثبات عطا کرتی ہے۔" کاش اس شہر میں کوئی اور اہل نظر پیدا ہوتا تا کہ اس کے وجود کو اثبات نصیب ہو اس سے بڑھ کر میں کیا اور دعا کر سکتا ہوں۔

جب بھی جام کا خیال آئے تو جمشید کا کلمہ پڑھنا ہی پڑتا ہے۔

بجام آئینہ حرف جم و سکندر چیست　　کہ ہر چہ رفت بہ ہر عہد در زمانۂ تُست

غالبؔ

اس لئے آپ بھی اس کی شاعری کو غور سے پڑھئے۔اس کی شخصیت سے لاکھ اختلاف ہو یعنی جہاں تک فن کا تعلق ہے آپ کو اسے ماننا ہی پڑے گا۔۔۔۔یگانہؔ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔یگانہؔ عظیم آباد کا ۔۔۔مقیم۔۔۔بیادل کا۔۔۔لکھنو والے عظیم آبادی کو کیسے برداشت کر سکتے یہ سچ ہے کہ یگانہؔ کو لکھنو والوں نے اس کا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھایا۔۔۔لیکن یگانہؔ کو اپنی زعم پارسائی پر ناز تھا۔وہ لکھنو والوں کی حرکت سے پریشان نہیں ہوا بلکہ یوں کہہ اٹھا۔

پھر لیا نامِ یگانہ بے وضو
یاد رکھنا میں ہوں میں اور تو ہے تو

یگانہؔ

یگانہ کے جنازہ اٹھانے کیلئے ۳ کرائے کے کہار منگوائے گئے چوتھا کہار نہ آیا۔۔۔اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی آج اس کے فکر وفن پر کام ہو رہا ہے یگانہ کی دریافت نئے سرے سے ہو رہی ہے۔

شاعری

ہر بڑی آواز کو پہچاننے کیلئے تنقیدی نگاہ کو تیز رکھنا پڑتا ہے کیونکہ یہ بڑی آواز اپنی ابتداء میں مقبولِ خاص وعام نہیں ہوتی، جب ایسا موڑ کسی بڑی آواز کے ابھرنے کے دور میں آجائے تو سمجھ لیجئے کہ فن کار کو اس کی زندگی میں کچھ نہیں ملتا وہ مستقبل کی تنقیدی ذہانت اور رویوں کا محتاج ہو جاتا ہے۔

ہماری اردو تنقید میں غالبؔ کو مستقبل ہی میں سب کچھ ملا ہے اس کی زندگی میں اس کی آواز سر سے گذرنے والی آواز رہی۔ مگر غالبؔ کے بعد اقبالؔ وہ خوش نصیب فن کار تھے جن کو زندگی میں ہی سب کچھ مل گیا۔ اس کی بڑی آواز اس کا بڑا لہجہ عام قاریوں تک نشاطِ ترسیل حاصل کرتا رہا۔ اقبالؔ کو اس کی زندگی میں نقادوں نے زبان سکھانے کی بات کی مگر اس کی بڑی آواز اور بڑے لہجے کی انفرادیت کا اعتراف بھی کیا گیا۔

یہ بڑی آواز اور یہ بڑا لہجہ کم از کم نصف صدی کے علمی اور تنقیدی ماحول میں پروان چڑھتا ہے ہر دور میں کوئی بڑا فن کار پیدا نہیں ہوتا ہمارا عہد قحط الرجال کا عہد نہیں خدا کا اتمام کرم میرؔ، غالبؔ و اقبالؔ پر ہی نہیں ہوا پھر بھی اس عظیم تنقیدی دور میں غالبؔ اور اقبالؔ جیسا فن کار کیوں نہیں پیدا ہوا۔۔۔

کیا بڑی شاعری اس عہد میں اب وہ نہیں ہے جو غالب اور اقبال چھوڑ گئے ہیں؟ جب قدروں کے اجالے گھٹ جاتے ہیں اور زندگی اندھوں میں ہاتھی کی طرح تجربے اور مشاہدے کی چیز بن جائے تو پھر لمس اور مشاہدوں کے اظہار سے جو کچھ وجود میں آئے گا اس عہد کا وہ عجوبہ ہی ہوگا۔ جس پر اس کے قاریوں کی نظریں جمی رہتی ہیں۔ جہاں تک اس عجوبے کی تشریح اور تفسیر کا معاملہ ہے وہ شرح غالبؔ اور اقبالؔ سے آگے کی چیز لگنے لگے گی۔ تمام شرحیں اس کے سامنے شرما جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ یہ ہمارے عہد کا المیہ ہے۔

اس عہد میں بہت سارے بڑے فن کار ہیں مگر وہ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے ''قد'' کے نہیں ہیں ان

کی مشترکہ بڑائی ادب میں مقام پاسکتی ہے لیکن ان میں سے کسی ایک کو بھی ہم سب سے بڑا فن کار نہیں کہہ سکتے۔ کل کے تنقیدی اصول و مبادیات آج کے تنقیدی اصول و مبادیات سے کچھ مختلف ہیں کل بڑے فن کار کی پہچان فن کار کی قوتِ متخیلہ سے ہوتی تھی جس فن کار کی قوتِ متخیلہ غیر معمولی ہوتی ہے اس کا تخلیقی بہاؤ بھی تیز ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنی فنی دسترس اور بصیرت سے ہر محشر خیال کو اس کی گرفت میں رکھتا ہے اس کی نگاہ کائنات کی طرح وسیع ہوتی ہے کائنات کی گردشوں، تیز و مدھم آوازوں کو سنتا ہے اور اسے شکار کرتا ہے اس کا یہ عمل خیال و فکر کو متحرک رکھتا ہے یہ وہ موسم ہوتا ہے جسمیں اس کا تخلیقی بہاؤ لفظوں میں سارے خزانے سمیٹ لاتا ہے۔

ہمارے ادب میں تنقیدی سوچ غیر ہندوستانی ہے یہاں کے ماحول میں جو ٹوٹ پھوٹ اور بکھراؤ ہے اس کے ذریعے مکمل اظہار تنقید میں در نہیں آتے ہماری تنقید دوسروں کی سوچ کے دائروں میں گردش کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ تنقید میں باز آفرینی کا عمل خود نقاد اور فن کار کیلئے ایک ایسا غیر محفوظ رویہ ہے جو فن کار کیلئے سم قاتل ہے۔

لب ولہجہ کا تعلق زندگی کے تجربات سے وابستہ ہے محدود شخصیتیں اپنے تجربات کو محدود لب ولہجہ میں بیان کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے فن کار کا شعری رویہ محدود ہو جاتا ہے۔۔۔۔ کیا مقیم اثر غیر محدود شخصیت کا مالک ہے۔۔۔ کیا اس کے تجربات وسیع ہیں۔۔۔۔ کیا وہ ان تجربات کو خلوص کے ساتھ برتتا ہے۔۔۔۔؟ کیا وہ پرے ہٹ کر اپنے فن پر تنقیدی شعور کی نگاہ ڈال کر وسعت پیدا کرنے میں کامیاب ہے۔۔۔۔ کیا وہ ندرت و رعنائی خیال کو حیات کے وسیع تناظر میں فکر کے ساتھ پیش کرتا ہے۔۔۔۔ اس کا فیصلہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔۔۔۔ ویسے بھی بڑے لوگوں کو صحبتیں بھی بڑی ملتی ہیں۔۔۔۔ میر بننے کے لئے دلّی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر زبان حاصل کرنا پڑتی ہے۔ غالب۔۔۔۔ ہونے کیلئے اکبر آباد میں پیدا ہونا پڑتا ہے جب کہیں غالب، غالب ہے۔۔۔۔ اور اقبال ہونے کیلئے لاہور میں پیدا ہونا پڑتا ہے۔۔۔۔ اور مقیم اثر ہونے کے لئے بیاول میں پیدا ہونا پڑتا ہے۔

شاعری مقیم اثر کے بموجب "۔۔۔۔ شاعری میرے نزدیک ہوش اور جوش کا حسین امتزاج ہی نہیں تخلیقیت کا نور و ظلمت میں ڈھلا وہ سحر انگیز انقلاب ہے جسے ہم زندگی کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔" شاعر کی آنکھ ایک ایسا آئینہ ہے جسمیں ساری کائنات اپنا عکس دیکھتی ہے۔۔۔۔

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ
طوطی کو، شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

غالبؔ

کہتے ہیں آدمی اپنی گفتگو ہی سے پہچانا جاتا ہے مقیم اثر کے قد و قامت کو اس کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے جو لوگ فکری اجتہاد اور شعوری جذبوں کے ساتھ اپنے سفر کی طرف گامزن ہوتے ہیں۔ انہیں کامیابی ملتی ہے اس کا اسلوب دور ہی سے چاند میں داغ کی طرح نمایاں ہے اس کے خیال و عاطفہ کے رنگ و روغن سے شعری کائنات قائم کی ہے اس کی قادر الکلامی اور طلاقتِ لسانی کا ثبوت دیکھ سکتے ہیں اس نے واقعات اور انساب کو کس خوبصورتی سے اپنے شعروں میں پرویا ہے اس کا شعری سفر آگ سے پھول تک ہے۔ داخلی شعلہ پھول بن کر شعری پیکر میں ڈھل جاتا ہے۔ مقیم نے اپنا اسلوب لہو کے صیقل سے آب دار کیا ہے۔

پھر حسن کا دریا مرے احساس سے گذرا — پھر مجھ میں رواں ہونے لگیں چاندسی غزلیں
پھر سر پہ کسی شاخ کا آنچل تو نہیں ہے — پھولوں کی مہک دینے لگیں آگ کی لپٹیں
خورشید نظر بن کے رگ جاں میں اتر جا — یوں جلوہ صد رنگ سے محروم ہوں شامیں
غواص کوئی ہمسر گوہر ہی نہیں ہے — سر بحر کے شانوں پہ رکھے سو گئیں سیپیں
ہم اپنی ہی عظمت کے اندھیرے میں پڑے ہیں — تو آئے تو کچھ رات کٹے نیند سے چونکیں

آج کی غزل کی زبان بدل چکی ہے غزل تہہ دریا، صدف خاموش موجوں کی روانی ہے۔ گہر کی جستجو میں وہ فن کار کو پیاسا دیکھنا چاہتی ہے۔ غزل دیوانگی سے دریا پار کرنے کا نام ہے۔ غزل دریا ہے اور دریا کے سینے میں دریا نکالنا معمولی بات نہیں ہے۔ غزل سراب تشنگی میں پھیلا ہوا ایک استعارہ ہے جسمیں کائنات خود ہوسِ دریا بن کر پس دریا ٹھکانہ چاہتی ہے۔ غزل زبان ہوش پر کانٹوں کی پھیلی ہوئی چادر کا نام ہے غزل جہان حصار رنگ ہے وہیں در خورشید سے ہنستی ہوئی پھولوں کی چادر کا نام ہے آج کی غزل ایک پتی میں ایک انوکھا منظر دیکھنا چاہتی ہے۔۔۔ ''اور شاعر کے پاس دنیا کو دینے کے لئے کوئی چیز نہیں سوا اپنے شعروں میں انوکھے پن کے ایک تصوّر کے۔۔۔'' آج کی غزل نگار تیغ ہے خوشی کو شورو

چیخ میں بدلنے کی متقاضی ہے مقیم اثرؔ کے بموجب۔

"۔۔۔۔۔انہوں نے چیخ کو اپنے آپ سے ایسے ہی منسوب نہیں کر دیا ان کے نزدیک یہ چیخ اس بزم موسیقی میں "لے" اور آہنگ کے تعارف کے لئے ہے اس افتاد کو سامنے رکھے بغیر ممکن ہی نہیں تھا کہ آپ کو نغمے کا تعارف کرا سکوں کیونکہ امر مسلمہ ہے کہ ہر چیز اپنے تضاد سے پہچانی جاتی ہے نغمہ اور چیخ کا ادراک ہی دراصل وہ فطری ذوق ہے جو خود نغمے کو چیخ سے الگ کر دیتا ہے اس امتیازِ خاص کو ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں۔ چیخ عبارت ہے شکست دل سے، شکستِ دل عبارت ہے زماں و مکاں کی گردشوں میں آئینے کے پاش پاش ہو جانے سے اور نغمہ گری عبارت ہے اس شکستہ آئینہ کی بکھری ہوئی کرچیوں کو "لے" اور آہنگ کے دل نشیں ہوش رُبا تاروں سے ربط کے متنوع تہذیبی انضباط کا۔۔۔"

کائنات کی انسان سے ذہنی وابستگی فکر و خیال جیسا سلوک اس کے تصور سے وابستہ ہوتا ہے ویسے نتائج فکر کے ذریعے سامنے آتے ہیں۔ شاعری حقیقت کو چھو لینے کا نام نہیں ہے حقیقت کو اپنے اندر جذب کر لینے کا نام ہے۔ کوئی لفظ چھوٹا یا بڑا نہیں ہوتا بلکہ لفظ شخصیت سے جڑے ہوتے ہیں۔ مقیم اثرؔ کی شخصیت، اس کے لب و لہجے میں پوشیدہ ہے۔ اس کے ہونٹ بے زنجیر، آنکھیں برہنہ ہیں۔ اُس کی شاعری مرثیہ لبِ دلگیر ہے۔ تیشۂ چشم سے پہاڑ کاٹنے کے مترادف ہے۔

ہم مٹ گئے نشان قدم چیختا رہا
نیزے بجھے ہوئے ہیں علم چیختا رہا

تیری سماعتیں نہ کھلیں سبز پیڑ پر
حرفوں کی ٹہنیوں پہ قلم چیختا رہا

ہم بے حسی میں سنگ سے آگے نکل گئے
سنتا ہے کون مونس و غم چیختا رہا

یہ رہگذار سنگ ہے بہہ جائے گا لہو
شیشوں میں ٹھہرا نقش و الم چیختا رہا

انکار قطرہ قطرہ لہو میں اتر گیا
اقرار لب پہ رکھ کے قسم چیختا رہا

اشکوں کے بعد آتی ہے برسات پھول کی
سمجھے نہ ہم ہی دیدۂ نم چیختا رہا

قبروں میں اب تو کچھ بھی نہیں دھول کے سوا
برباد ہوتا شہر حشم چیختا رہا

سائل ہی میں وہ سوزش باطن نہیں رہی
سائل نواز دستِ کرم چیختا رہا

مجبوریوں کے جبر سے چہرہ نڈھال تھا
میں چپ ہوا تو میرا بھرم چیختا رہا

دم بخود سورج ہے دریا تھک گئے اظہار سے
میں بہت آگے ہوں اپنے وقت کی رفتار سے

عشق جوگی سانپ کی آنکھوں میں بھی آسن جمائے
جس کو منتر یاد ہے وہ سانپ کے آگے چلے

پیڑ آگے بڑھ سکے کب چھاؤں کی زنجیر سے
کٹ گیا میں راستے میں دھوپ کی شمشیر سے

درخت سو گئے تمام اپنی چھاؤں اوڑھ کر
یہ کس کے تن کی دھوپ ہے جو بچھ گئی سفر سفر

جہانِ حسن کا ہر ایک نقش تیرا معتبر
مگر ادھر بھی اک نظر اے دیدہ ور اے دیدہ ور

مرے ہی اشک ہیں جو ڈھل گئے مہر و ماہ میں
مرے لہو کی چاندنی کا پیرہن شجر شجر

وہی کلی ، وہی گہر ، وہی کرن ، وہی سبو
ترا جمال شعلہ رو جہاں تہاں ادھر ادھر

ارتقائے غم سے کٹ کر اور میں مدھم ہوا
شعلہ بننا چاہیے تھا پیکر شبنم ہوا

دیکھنا ہے اب کسے چنتی ہے چشم التفات
اک طرف ہے ذات میری، اک طرف عالم ہوا

دھیرے دھیرے زور کم ہوتا گیا سیلاب کا
اور پھر ساحل سے اونچا ریت کا پرچم ہوا

جسکی حسرت میں ہمارے خواب تک شاداب تھے
اب ہماری جان کا دشمن وہی موسم ہوا

رونا تو آتا ہے تجھے بھی
میرے آنسو رو کے دکھا

یہ شعر کتنا سادہ ہے اسمیں کوئی دقیق لفظ نہیں ہے اس سادگی میں جو انداز بیان ہے وہ بھرپور طریقے سے درد سے لبریز ہے۔ شاعر نے معمولی مضمون کو کس پُر درد طریقے سے پیش کیا ہے اور دوسرے مصرعے نے شعر کو کتنا اونچا اور بلیغ کر دیا ہے یہ سلاست یہ انداز بیان ہزاروں فارسی آمیز تراکیب والی غزلوں پہ بھاری ہے اس ایک شعر میں کیفیت کو جس اندازِ سے بیان کیا گیا ہے وہ شعر نہیں ماورائے شعر ہے جسمیں ''درد'' کی کسک کو سادگی کے جوہر میں پرو کر پیش کر دیا گیا ہے انداز بیان حسن کی داد نہیں دی جا سکتی یوں تو ہر کوئی دوسروں کے غم میں شریک ہوتا ہے سب کو روتا دیکھ کر کچھ یار لوگ سوگ منا لیتے ہیں میرا اپنا ایک شعر ہے۔

سب کو روتا دیکھ کے یارو
ہم نے بھی کچھ سوگ منایا

لیکن جو غم اور مصیبتیں جن پر پڑتی ہیں اس کا اوروں کو غموں سے واسطہ نہیں پڑا اسلیئے شاعر یہ کہنے پر مجبور

ہو گیا۔۔۔۔میرے آنسو رو کے دکھا۔۔۔۔ ہر ایک کو اپنا غم اور تکلیف برداشت کرنی پڑتی ہے کسی کی شرکت سے میرا غم ہلکا نہیں ہو سکتا بلکہ جو تکلیفیں اور زندگی کی اذیت خود اٹھاتا ہے وہی آنسوؤں کی قدر و قیمت سمجھ سکتا ہے۔ شعر میں براہ راست اظہار حقائق کی ترجمانی کو فکر و فن کے ساتھ پیش کرنا معمولی بات نہیں ۔اسمیں شاعر کا تجربہ، انوکھا سیدھا سادہ بیان اور کبھی کبھی بے تکلف اظہار بھی کافی ہوتا ہے۔ مضمون کو سادگی و صفائی سے بیان کر دینا کافی ہوتا ہے۔

کہاں تلک نمائشِ بنامِ فن، شعور کی　　　شرر کی بے بضاعتی کو پردہ دار سنگ کر

اس شعر میں فن کی اندرونی کیفیت کو کس بلیغ انداز میں پیش کیا ہے آج جس کو دیکھو وہی شخص اپنے فن کی نمائش کرنے پر تُلا ہوا ہے لیکن شاعر نے فن اور شعور کی نمائش کو شرر کی بے بضاعتی بتایا اور پردہ دار سنگ سے یہ مطالبہ کر کے اس نمائشی ہتھکنڈے کو چھپا لے فن کسی اشتہار یا نمائش کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بہ خود وقت کے ساتھ اپنا لوہا منوا لیتا ہے یہ نمائش وقتی چیز ہے دیر پا نہیں رہتا بقول احمد نسیم مینا نگری پھول کو خوشبو کے اظہار کی ضرورت نہیں اس کی مہک خود بخود پھیل جاتی ہے۔

مقیم اثر کے بموجب "۔۔۔۔میرا وجدان شعور کی نئی تبدیلی حسن کے تسلسل میں دیکھنے کا آرزو مند ہے کہ مربوط اور بدلتی زندگی کی یہی سب سے بڑی معرفت اور سچی تفسیر ہوگی۔۔۔۔"

بادِ مخالف کیا لینا ہے ہم کو پُرانے رستوں سے　　　آنکھ کھلے تو گم ہوتے ہیں خواب ہماری پلکوں سے
میں بھی آدھا تم بھی آدھے، آدھی دنیا آدھی پیاس　　　اپنے آدھے حصے ہم سب ڈھونڈ رہے ہیں صدیوں سے
پہلے بدن کی اندھی گپھوں سے آزادی تو حاصل ہو　　　شاخیں تجنا سیکھ ہی لوں گا میں بھی اڑتے پرندوں سے
خواہشیں بھی اَن دیکھی سلاخیں جسم کو گھیرے رہتی ہیں　　　جانے کب آزاد ہوا انساں مٹی تیرے گھروندوں سے
زہر کی حد میں اپنی ترقی اک منزل کو پہنچی ہے　　　سانپوں سے تو ڈر نہیں لگتا ڈر لگتا ہے ان سپیروں سے
ریت کے رنگ برنگے منظر آنکھ کے حق میں تازہ عذاب　　　ہم پچھتائے رشتہ جوڑ کے گرتی ہوئی دیواروں سے
دھوپ کا انت اگر مل جاتا یہ مجبوری کیوں ہوتی　　　ہم بھی سایا مانگ رہے ہیں بارش گرتے پیڑوں سے
پگھل جاتی ہیں زنجیریں سلگ اٹھتی ہیں دیواریں　　　لہو جب آگ ہوتا ہے لہو جب تیغ بنتا ہے
ابھی تو خواب کے پہلو میں بس رہا تھا کوئی　　　ابھی سے سینہ گیتی میں کیسے شور اٹھا

کیا ملا قطع تعلق کی سزائیں سہہ کر
اس سے ملنے مری دیوار کا سایا جائے

آسماں آپ ہی مصروف ثنا ہوتا ہے
جب بھی دریا کے مقابل کوئی قطرہ جائے

گھنے تھے پیڑ مگر چھاؤں میں بٹھا نہ سکے
یہ اپنے قد کی طرح میرا قد بڑھا نہ سکے

چٹانوں میں نور نہیں ہے
ریت کی کھڑکی کھولے کوئی

کوئی آبلہ پا ادھر کیوں نہ آیا
یہاں بھی صحرا کی افسردگی ہے

نئی آس شاید گلے مل رہی ہے
مری یاسیت منہ اتارے کھڑی ہے

لوگ جینے کی تمنا میں مرے جاتے ہیں
پھول کے نام پہ کانٹے بھی چنے جاتے ہیں

آسرا عام ہوا ریت کی دیواروں کا
اپنے مقصد کیلئے لوگ گرے جاتے ہیں

دوپہر سر پہ ہے کیا چیختی یادوں سے ملیں
یہ صحیفے تو سرِ شام پڑھے جاتے ہیں

کوئی کلیم نہیں طور کی بلندی پر
سنے گا کون یہاں لن ترانیاں میری

میں نے اپنے مضمون ''جلال، جمال اور نوال کا شاعر'' مقیم اثر بیاولی کے بارے میں لکھا تھا۔۔۔ مقیم اثر کی شاعری اپنے عصر کی پابند ہے اس پابندی میں زماں و مکاں بھی شامل ہیں جسمیں وقت کی چیخ و پکار، تنہائی کا کرب، فرد کی عظمت و شکست و ریخت کا المیہ بھرا نوحہ بھی سنائی دیتا ہے جہاں آگہی اور رمزیت کے پہلو میں عارفانہ نکتہ سنجی بھی پوشیدہ ہے وہیں صداقت خیر اور حسن کی رعنایاں بھی ہیں جہاں سے اس کا ذہن خلاقانہ توانائی حاصل کرتا جو ان کے فن کارانہ ذہن کی فوق الشعوری خوبی کا معجزانہ کمال ہے۔

ارض و سما سے اونچا اپنا مقام ہو گا
دل کو حرم بنا لو کعبہ غلام ہو گا

گفتگو ان کے بارے میں تھی
مرحلہ آگیا ذات کا

مقیم اثر کے یہ دونوں شعر یقیناً بے مثال ہیں بقول کرامت علی۔۔۔۔ دل کو حرم بنانے کی آرزو تو اردو اور فارسی کے بہت سے شاعروں نے کی ہے لیکن اثر سے قبل غالباً کسی نے یہ کہنے کی ہمت نہیں کی تھی کہ۔۔۔۔ دل کو حرم بنا لو کعبہ غلام ہو گا۔

مقیم اثر جیسا بے باک شاعر ہی یہ کہہ سکتا ہے۔

سبزہ ہے تو دھرتی کو لگا سینے سے　　دریا ہے تو پیاسوں کے مقدر میں اتر

یہ وسیع النظری دل کو حرم بنانے کا نتیجہ ہی تو ہے۔

دوسرا شعر اپنی مثال آپ ہے بے پناہ شعر ہے محسوساتی شعر ہے ذات سے اجتہاد کا مرحلہ بڑا نازک ہوتا ہے یہاں ذات صرف نفی محض نہیں ہے بلکہ اثباتِ ذات کی آئینہ دار ہے حدیث قدسی کے مضمون کو صداقت کے ساتھ جس خوبی سے بیان کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ ''۔۔۔ میں ایک مخفی خزانے کی مثل تھا پھر میری خواہش ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں تو میں نے انسان کو پیدا کیا'' اس شعر کا مبداء کیا ہے وہی ہے جس کی طرف انجیل مقدس نے اشارہ کیا ہے ''۔۔۔ پہلے کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خود خدا تھا''۔ ذات کے شعور کے ساتھ حجاب قدس کا ادراک رکھنا ضروری ہے کیونکہ کون و مکاں کی تخلیق کا عروج ہی نہیں منتہائے مقصود بھی یہی ہے۔

خلقت مبرا من کل عیب　　کانك قد خلقت کما تشاء

اگر خدا ہر انسان کو اس کی خواہش اور معیار ہی کے مطابق بنا دے تو پھر اس ذات کے کمالات کو کون پہنچ سکتا ہے؟ صرف حضور ﷺ ہی کی ذات گرامی ہے جو ہر عیب سے پاک ہے گویا آپ بعینیہ ایسے پیدا کئے گئے جیسا کہ منشائے الٰہی تھا۔۔۔۔۔۔ مقیم اثرؔ کا یہ شعر یقیناً اردو ادب میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔ کمال سخن کے دیوانوں سے داد کا مستحق ہے۔

نظام صدیقی، مقیم اثرؔ کی شاعری پر یوں رقم طراز ہے۔

''۔۔۔۔ بیشتر برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است کی امین مقیم اثرؔ کی غزلیہ، تثلیث زندگی محبت اور عبادت سے عبارت ہے زندگی بیج، محبت پھول اور خدا خوشبو ہے یہ سب دائروی شکل میں ایک ہیں اور بیک وقت جمال، کمال اور نوال کے امین ہیں۔ ہر وہ نظریہ رویہ اور برتاؤ جو اس فکری اور جمالیاتی وحدانیت کو ریزہ کار کرتا ہے مقیم اثرؔ کی شاعری اس کے خلاف بے محابا سخت احتجاج کرتی ہے اور اسمیں بے اختیار رمز آگیں طنز کی صلابت پیدا ہو جاتی ہے۔ اولین شعری مجموعہ ''**لا تقنطوا**'' میں یہ اتنا زیادہ کاری، تہہ دار اور توانا نہیں ہے اس کے برخلاف ''نغمۂ سنگ'' میں ان کے منفرد و احتجاجی اور مقاومتی

لب ولہجہ اور کٹیلا تیکھا انداز زیادہ موثر دھار دار اور کارگر ہے۔۔۔۔"

خاموشی تھی حسن تکلم جدت فن میں ماہر تھا
روشن آنکھوں والا شاعر بینائی سے قاصر تھا

دیواروں کے کان میں جانے چپکے سے کیا کہتا تھا
اینٹ بچھڑتی تھی اینٹوں سے کیسا بلا کا شاطر تھا

ہم ہی نہیں پیچیدہ ڈگر پر چلنے والے اور بھی ہیں
یہ کہنا کم ظرفی تھی اپنی ہم سا کون مسافر تھا

گلیوں گلیوں شور تھا جس کا اک دلکش آواز تھا بس
میرے شہر کا گونگا پتھر لفظ و بیاں کا ساحر تھا

ظاہر باطن ایک تھا اس کا کیا بچتا بربادی سے
مسند زر کے مدّ مقابل بھولا بھالا تاجر تھا

اک بے بس انساں کی حقیقت موت کے آئینے میں کھلی
قادر اصل میں اور کوئی تھا میں بس عبدالقادر تھا

اپنی ذہانت اپنی جسارت کام نہ آئی رستے میں
لٹ کر نصرت شہر جو ہم پہنچے ہیں تو غائب ناصر تھا

بستی کے حالات نے پردہ فاش کیا ایوانوں کا
کس کو محبت تھی لوگوں سے کون حقیقی جابر تھا

ساری خلقت مہر بہ لب تھی چیخ رہا تھا دیوانہ
اپنی غرض کی راہ میں بندہ کتنا صابر و شاکر تھا

سچائی پردے میں رہے اس بات سے اس کو نفرت تھی
دیوانے کا یہ مسلک تو آپ سبھی پر ظاہر تھا

آج مجھے ٹھکرا دو گے تم لیکن کل خود مانو گے
اپنے لب ولہجے کا اثرؔ اک سب سے نرالا شاعر تھا

پوری غزل میں سچائی اور حقیقت کے پردے میں زندگی کی حقیقت کو جس طرح عریاں کیا گیا ہے وہ قابل داد ہے پوری غزل میں جو نشتر اور کاٹ پنہاں ہے وہ اہل نظر سمجھ سکتے ہیں۔ اسمیں نہ تو بے سمت سفر کا نوحہ ہے اور نہ ہی جدیدیت کی تبلیغ لیکن جس معاشرے میں ہم رہتے ہیں اس معاشرے کی روزمرّہ زندگی کی سیدھی سادی تصویریں خلوص و آگہی کے ساتھ شاعر نے برتی ہیں اسمیں اس کا اپنا ہنر بھی پوشیدہ ہے بقول نظام صدیقی

"۔۔۔۔مقیم اثرؔ اپنی فکر و نظر کی تمام توانائی مابعد جدیدیت اور تخلیقیت پرور جاذب لب ولہجہ کے نکھار پر صرف کر رہا ہے جو اس عہد ریاکاری اور نامردی میں خاصہ مردانگی کا حامل ہے جس میں فیشن جدیدیت گزیدہ شاعروں کو "حقیقی خود کلامی" سے خوف محسوس ہوتا ہے یہ غیر مخنث لہجہ قوتِ رجولیت اور تخلیقیت سے بھرپور ہے۔"

شاعری میں وسعت اور یکتائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسمیں احساس کا سرچشمہ موجزن ہو۔ شاعری ذات کے ادراک اور حسّی دھڑکن کا نام ہے جسمیں اس کے اپنے ذاتی تجربے ہوتے ہیں ہر بڑا شاعر کائنات کا ادراک اپنے اندر محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کے ''اندر'' ایک اسرار ہے ہر بڑا فن کار تجرباتی ذہن رکھتا ہے اس کا شعور اور لاشعور تجربے و مشاہدے کو حسیاتی سطح پر پرکھتا ہے۔ تجربے اور مشاہدے کی اہمیت کا دارومدار ''وجدان'' پر ہوتا ہے یہی وجدان شاعر کے جذبے و تخیل کو وسعت اور طاقت بخشتا ہے۔ جسمیں آمد زیادہ اور آورد کم ہوتا ہے ہر غیر معمولی فن کار کے یہاں جوش و جذبہ میں بھی باطنی گہرائی پائی جاتی ہے۔

مقیم اثرؔ بنیادی طور پر تخلیقی مزاج رکھتا ہے اس کی غزلوں میں اشاریت اور ایمائیت کلاسیکی تکمیل کے ساتھ عصری مسائل کو یعنی خارجی مسائل کو باطنی گہرائی کے ساتھ دریافت کیا جاسکتا ہے نیز اسمیں کوئی شک نہیں اس کا مزاج جارحانہ اور مجاہدانہ ہے لیکن اپنے سینے میں '' شاعر کا دل'' بھی رکھتا ہے۔ اس کی شاعری میں موجودہ عہد کی سفاکی روحانی کرب، شعوری الجھنیں، خودفریبی، اخلاقی انحطاط، سماجی محاسبہ اور سیاسی جبریت کا استعارہ بھی ہے۔

دہشت، ہراس و خوف اداسی آج کا مقدر بن گیا ہے انسان کے اندر جو زلزلہ برپا ہے اسمیں تنہائی شکستگی اور انسانی جبلت کو اپنی ذات کے ذریعے خارجی دنیا کے تجربوں کے ساتھ پیش کرنا اور انکشاف ذات کا رویہ اجتماعی شعور و تہذیبی قدروں کا آئینہ دار ہے شاعری صرف ستاروں سے گفتگو کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقت کو تخیل کا روپ دینا شاعری ہے حقیقت کے ساتھ ماورائے حقیقت پیش کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مقیم اثرؔ کی شاعری صرف جذباتی تخیل کا نمونہ نہیں ہے اس کی حزنیہ لے کے ساتھ شعوری رجائیت کے پرتو کو محسوس کیا جاسکتا ہے اس کے یہاں پیش پا افتادہ مضمون بھی ہے اور روایت کا گہرا عکس بھی لیکن وہ عکس تقلیدی یا اکتسابی نہیں ہے بلکہ روایت کی تجدید و توسیع ہے کیونکہ تجربے کے بغیر تقلید نقصان دہ ہے۔ اس کے تخلیقی عمل میں ایک طرح کی جاذبیت اور اثر آفرینی ہے مقیم اثرؔ کی شاعری کا اجمال، تفصیل سے زیادہ بہتر ہے کم سے کم لفظوں میں کثیر المعنٰی کی اچھی مثال کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

غم کا دریا نظر نہیں آتا　　کون ڈوبا نظر نہیں آتا
جل رہے ہیں درون خانہ ہم　　اور شعلہ نظر نہیں آتا
سر بریدہ خداؤں کی پہچان کیا　　نم نمیدہ ہواؤں کی پہچان کیا
کاسہ ہر صدف گنج گوہر طلب　　آفریدہ صداؤں کی پہچان کیا
لہو میں پستیاں داخل ہوئی ہیں　　عزائم، تیغ، رن جھلسے ہوئے ہیں
طیور، آفاق، جنگل، دشت، دریا　　ہوا، تارے، کرن، جھلسے ہوئے ہیں
قتل گاہوں سے سرخرو لوٹا　　تیغ اپنا مکاں ہوا مجھ پر

یہ سچ ہے کہ فرد کی عظمت بظاہر تنہا دکھائی دیتی ہے لیکن وہ اس ایک آئینے میں پورے سماج و معاشرے کو دیکھ لیتا ہے آئینے کے پس منظر میں اجتماعی ذات کا نظارہ کیا جاسکتا ہے جسمیں خارجی حقیقت سے باطنی حقیقت، معاشرتی گھٹن، سماجی نا آسودگی کا کرب اور غیر یقینی صورت حال کے باوجود رجائی رویّے کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ تنہائی کا رونا کہیں حوصلے کی شکست کا اظہار ہے تو کہیں عافیت بخش زندگی کا اظہار بھی، انسان ازل سے نا تکمیلیت کا شکار رہا ہے اسی لئے وہ کبھی کامل نہیں ہو پاتا

ہم نے کرنوں کو سمجھ رکھا تھا سورج ورنہ　　کتنے سورج بھی تو کرنوں کے طلبگار ہوئے
ارشد نظر

--کیونکہ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں-----

دیواریں رو رہی ہیں دریچہ اداس ہے　　اجڑے مکاں کو پھر ترے آنے کی آس ہے
پیڑ جائے نہ کوئی ابر کا ٹکڑا جائے　　دھوپ سے تجھ کو بچانے مرا سایا جائے
عمارتوں سے الگ باضمیر رہتا ہے　　گلی کے موڑ پر اندھا فقیر رہتا ہے
اسے بھی قتل نہ کردے یہ شہر سنگ گماں　　کمان بزم یقیں میں جو تیر رہتا ہے
ہوئی حقیقت مطلق سے گفتگو جس کی　　وہ امتوں میں نذیر و بشیر رہتا ہے
وہ ایک شعلہ رہ پیچ و تاب میں کیا تھا　　درونِ ذات حضور و غیاب میں کیا تھا
مرا وجود ہی حائل تھا درمیان حجاب　　جز احترام، حدود حجاب میں کیا تھا

اسمیں کوئی شک نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص ایک خیالی پیکر رکھتا ہے جس کے اندر سے ایک نامعلوم

حقیقت جھلکتی رہتی ہے ہماری دنیا گویا ایک طلسماتی جنگل کی طرح ہے جس میں رنگینی حیات کے جلوے کے ساتھ زخم خوردہ غزالِ ختن کی شکل بھی المیہ کی سی نظر آتی ہے کیونکہ فن کار خارجی دنیا سے شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر رہتا ہے اسی کا ردّ عمل اس کی اپنی شخصیت اور فن میں جلوہ نما ہوتا ہے عمل اور ردّ عمل کا اظہار بھی اپنے وجود کے ذریعے کرتا ہے کیونکہ شاعری وجود کی توسیع کے فن کارانہ اظہار کا نام ہے جس میں خیال اور فکری شعور کا وجود الہام کی صورت میں نظر آتا ہے۔

مقیم اثرؔ کا ذہن شعور اور تحت الشعور کے پرتو کا مرکب ہے اسمیں کوئی شک نہیں کہ اس کا ذہن ایک فوق الشعوری پرت اور خوبی رکھتا ہے۔

میں سمندر کی کوئی گہری خموشی اور وہ — اک جہاز نطق سطح آب پر ٹھہرا ہوا
پیاس ہونٹوں پر لئے نکلا تو ٹھکرانے لگے — میں ہوا دریا تو مجھ کو لوگ اپنانے لگے
سورج ہے اگر سارے جہاں پر چھا جا — ذرّہ ہے اگر تو ، شہہ خاور میں اتر
کیڑوں کی طرح خاک میں ڈیرا کب تک — انساں ہے اگر گنبدِ بے در میں اتر
جلتی ہوئی یادوں کے لمحوں سے لپٹ جانا — ہم یاد اگر آئے پھولوں سے لپٹ جانا
بڑھتی ہوئی وحشت کا اللہ رے یہ عالم — پھولوں کے تجسس میں کانٹوں سے لپٹ جانا

نظام صدیقی نے مقیم اثرؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی معقول بات کہی ہے۔

"--- ان کی "تند جبینی" کے باعث کہیں ان کی زبان میں ناہمواری بھی محسوس ہو سکتی ہے در حقیقت برافروختہ اور برگشتہ خیال اسی انداز میں وارد ہوا ہے جس طرح ان گھڑ شکل اختیار کر گیا ہے یا اکثر بات سوچی ہی اس غیر مانوس زاویہ سے گئی ہے جس طرح نامانوس طور پر بیان ہوئی ہے پھر کسی حد تک رطب و یابس تو ہر سخن ور کے یہاں ہوتا ہے ناخدائے سخن میرؔ اور یگانہ روزگار شیکسپیئر کا کلام اس امر کا شاہد ہے لیکن ارباب فکر و نظر کوئی حتمی رائے اس کثرت پر قائم کرتے ہیں جو اس کے کلام میں موجود ہے۔" مقیم اثرؔ کے کلام میں یہ حسن اور معنی آفریں کثرت اس کی غیر معمولی طاقت، وجدانی اور فکری وحدت کا امین ہے جو اسی کی غزلیہ شاعری کو مابعد جدید چہرہ عطا کرتی ہے اور ذوق سلیم کے حامل قاری کو اپنے

مطالعے سے قرار واقعی جمالیاتی تسکین اور ہمہ گیر انسانی بصیرت عطا کرتی ہے۔ مقیم اثرؔ مابعد جدید اردو غزلیہ شاعری کا ایک رعنا، توانا اور نا قابل تسخیر دستخط ہے جو پانی پر نہیں بلکہ ایک حد تک ابدیت کے صفحہ پر ثبت ہو گیا ہے۔ بقول ورجل "۔۔۔۔اس فانی دنیا میں اچھی تحریر کو بقائے دوام حاصل ہے۔۔۔۔۔"

شاعری کا مطالعہ کرتے وقت ایک خصوصی ادبی و علمی مزاج کا ہونا ضروری ہے جس کے بغیر ادبی فن پارے کی معنوی تہ داری تک ترسیل ناممکن ہے یہ تو قاری کے اپنے مزاج پر ہے کہ وہ شعر کو کس معیار سے پرکھتا ہے ہر ایک کا اپنا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے۔ قاری اور شاعر کے مزاج کے درمیان بہر حال ایک فرق رہتا ہے اس فرق کو انگریزی شاعر نے بڑے خوبصورت پیرائے میں کہا ہے۔

Two men look out through the same bar

One sees Mud & One the Star

اور جسے اقبالؔ نے یوں کہا ہے۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

یہاں قاری کے ادبی ظرف کی طرف ایک اشارہ ہے کیونکہ ادب کی اعلیٰ قدروں تک عام شعر میں جو اشاریت پنہاں ہے اس کو سمجھنے کے لئے ایک خاص ادبی مزاج کا ہونا ضروری ہے اشاریت کا تعلق درون سے ہے خارج سے نہیں ہے اس لئے شعر میں ایک مبہم سا انداز رہتا ہے اسی انداز و تاثر کو جس میں ایجاز و اطناب یا رمز و ایما ہے احساس اور وجدان کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ مقیم اثرؔ کی شاعری میں لفظ اور اس کے مفہوم میں ایک پردہ بھی ہے اور معنی بھی۔

تفاوت است میانِ شنیدن من و تو تو غلق باب و منم فتح باب می شنوم

اسمیں کوئی شک نہیں کہ ادیب اور نشاط کے بعد مالیگاؤں کو مقیم اثرؔ جیسا بے باک اور قد آور شاعر نصیب ہوا جس پر آنے والی نسلیں ہمیشہ رشک اور فخر کریں گی۔

آج مجھے ٹھکرا دو گے تم لیکن کل خود مانو گے اپنے لب و لہجے کا اثرؔ اک سب سے نرالا شاعر تھا

مقیم اثرؔ اپنی شاعری کے آئینے میں اپنا عکس آپ ہے اسی عکس میں کچھ خامیاں اور زندگی کی کچھ کمزوریاں بھی سائے کی طرح لرزاں ہیں۔ انانیت کے آئینے میں اس کا گوشہ یا عکس صاف طور سے نظر

آتا ہے۔اس کی شاعری میں سوز دروں نفس آتشیں اور خونِ جگر کی آمیزش ہے وہ دل بہلانے کی خاطر شاعری نہیں کرتا اور نہ اپنی شاعری میں ہر غم کو غم جاناں بنا کر پیش کرنے کا عادی ہے وہ عروسِ زندگی کی حنا بندی کرتا ہے اور اسمیں مہذب سنجیدگی ہے نہ کہ دیوانگی۔۔۔۔انانیت کے پردے میں اس کا غرور بے جا نہیں بلکہ یوں کہیئے ہمچو ما دیگرے نیست کا جذبہ اس کے اندر بے پناہ ہے لیکن اسی جذبے نے اس کے اندر وہ قوت واستدلال پیدا کیا کہ مذہبی سیاسی اور تہذیبی تصورات کو اس کی شاعری میں دیکھا جاسکتا ہے۔

جب فن کار اپنی روشن ضمیری سے یا آگہی سے اپنے آپ کو پہچانتا ہے تو وہ شاعرانہ تعلّی کا اظہار کرتا ہے۔مقیم اثرؔ کی اپنی ایک ''لے'' ایک ''آواز'' ہے یہ ''لے'' کبھی مدھم، کبھی تیز یا پھر کبھی نامعلوم فضاؤں میں گم گشتہ آرزوؤں کی طرح بھٹکتی پھرتی ہے۔مقیم اثرؔ کی شاعری میں آنے والے عہد کا شعور بھی پنہاں ہے اسی بناء پر وہ عہد حاضر کا سب سے بڑا مزاج داں ہی نہیں اپنے عہد کا نباض اور اکیسویں صدی کا عظیم شاعر ہونے کا عارف ودعوے دار بھی ہے۔

میں زخم زخم اپنے لہو میں اتر گیا
صورت نظر نہ آئی مگر اندمال کی

اسی دھن میں اب پاؤں رکتے نہیں ہیں
مری خاک سے کوئی شعلہ اٹھے گا

جی رہے ہیں سب زمیں پر رکن زائد کی طرح
وزن اپنا کھو چکی ہے جیسے کوئی بحر دیکھ

دور نزدیک کوئی قافلہ ٹھہرا ہوگا
اپنی آواز ، اذانوں سے ملائے کوئی

دھواں اس نے رکھ کر چراغوں کی لو پر
مرے دکھ کی تصویر بھی کھینچ دی ہے

اپنی تکرار سے شرم آنے لگی
کس کو آواز دوں کون ہے سامنے

رکھدیا اپنا سر پائے ناقوس پر
جب اذانوں کے در بند ہم پر ہوئے

رقص طاؤس نہیں تم بھی نہیں
سبز جنگل بھی جلے ہوں جیسے

ہر موج کو دریا کے مراتب نہیں ملتے
کہنے کو ہر اک موج ہے وابستہ دریا

فرش گل پر چیختی بنجر زمینوں کا تسلّط ہر طرف ہے
ریزہ ریزہ ٹوٹتے خوابوں پہ خوابوں کا تسلّط ہر طرف ہے

ہم بکھرتے پھول کی فریاد سننے کے لئے حاضر ہوئے تھے
سہمی سہمی شاخ پر پاگل ہواوں کا تسلّط ہر طرف ہے

مقیم کی شاعری میں زندگی کی لذت تخلیق بھی، قانون حیات بھی ہے اور اس حیات کے ساتھ مضمونِ حیات کے جوہر پارے بھی موجود ہیں مقیم کی شاعری میں زندگی، محبت، معرفت تصوف اور ابرووں کے اشارے بھی ہیں گویا اس کی شاعری ایک مجموعہ اضدادِ گلستاں کا صد ساماں کئے ہوئے متاع جہاں کا سرمایہ ہے جس سے ہر کوئی اپنے پسند کے اشعار چن سکتا ہے صبح کی کرنوں کی طرح اس کے اشعار میں نرمی ملتی ہے تو مہتاب کی روشنی میں لذتِ زیست کا سرور بھی مل جاتا ہے اور شام کے پس منظر میں زندگی کا حسین استعارہ بھی۔۔۔۔۔۔۔ میرؔ کی شاعری کی طرح ہم مقیم کی شاعری کو رنج و غم میں ڈوبی ہوئی قرار نہیں دے سکتے ہیں۔

بلا شبہ مقیم اردو ادب میں حلقہ آفاق میں گرمئی محفل ہے جہاں نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو جہاں مقامات تصوف ہیں وہاں مقامات عشق بھی ہیں اور مقامات زندگی بھی اس لئے اس کی شاعری سینہ صاحبِ نظراں کے لئے ہے۔

بقول نظام صدیقی ---- ما بعد جدید عالمی ثقافت کے اھم ناقابل فراموش پھلے بنیاد گذار، کج کلاہ، تخلیقیت آفریں، تخلیقیت پَرور، تخلیقیت کُشا، نو اقداری اور نو جمالیاتی کارگردگی کے لا تمثیل فن کار----- مقیم اثر بیاولی---- ما بعد جدید تخلیقیت افروز غزل حقیقی معنی میں نئے ھزارہ کی عالمی اور ملکی ما بعد جدید تناظر کی پوری ھم عصر زندگی، انسانی ذات، کائنات، فطرت اور خدا کی حسین اور عظیم سمفنی (Symphony) سے ھم آھنگ ھو گئی ھے۔ عالمی اور قومی ما بعد جدید سیاق میں ایک نئی اضافی تخلیقیت، ایک نئی اضافی معنویت، ایک نئی اضافی عصریت، ایک نئی اضافی ناگزیر ھے جو اکیسویں صدی میں بھی نیو کلیائی آتش فشاں کے دھانے پر بیٹھی دنیا کے نت نئے چیلینج کو قبول کر سکے۔ فی زمانہ صرف چیلنج اور چنوتی ایک ایسی شے ھے جو لا زوال ھے لا مختتم ھے کسی بھی

ادارہ گزیدہ ، فیشن گزیدہ تو آبادیاتی اور ما بعد نو آمریاتی بلاک کی حامل ، حد بندی اور سیما ریکھا کے بغیر چیلنج کے رُخ کو بدلا جا سکتا ھے۔

وجود کے گھرے سمندروں کی شناوری سے ھمہ جھت اقداری، طرف کوش خرابہ، میں بھی نئے تخلیقاتی (Creational) انقلاب کی حامل نئی حسنیات اور قدریات کے موتیوں کے "اھرام" کو کھڑا کیا جا سکتا ھے۔

درحقیقت ما بد جدید چیلنج آگیں معاشرے میں نئے عھد کے تخلیقیت زندہ بیدار و توانا تخیل کی بغاوت ھے بغاوت تخیلیت حقیقی تخلیقیت ھے وہ "تناسخی گردشوں" کی امیں نھیں ھوتی۔ ادب میں ما بعد جدید حقیقی تخلیقیت کے معنویاتی اور کیفیاتی خطوط امتیاز کے لئے "سیاسی بغاوت نھیں" بلکہ ما بعد جدید "اولیں غزل گو مقیم اثر" جیسے غیر معمولی شعلہ آسا، نادرہ کار تخیل کی بغاوت لا بُدی ھے۔ جیسا کہ میں نے شروع ھی میں عرض کیا ھے کہ ۱۹۷۰ء میں جدیدت ایک گھرے سیاہ غار میں اتر چکی تھی چونکہ اس میں حقیقی تخلیقیت کا فقدان ھو گیا تھا۔ اور فیشن گزیدہ تقلید، تکسیر ، تصغیر اور ادارہ رسیدہ تحکیم کی بد روح اس میں حلول کر گئی تھی۔

اپنے وجود کے آب زاروں میں غواصّی کے بعد 'نئے راستوں میں" اکیلے چلنے اور نئی پگڈنڈیوں پر سفر ، مدام سفر کا غیر معمولی تخلیقی حوصلہ فنا ھو گیا تھا۔ جس سے مقیم اثر "نھایت اندیشہ" اور "کمال جنوں" کے ساتھ بیک وقت نھایت متناقص طور پر ھمیشہ سر شار اور بیدار رھتا ھے۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے — بُری ہے مستی اندیشہ ہائے لولا کی
وہ حرف راز کہ مجھکو سکھا گیا ہے جنوں — خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں
ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا — وہ خود فراخئی افلاک میں ہے خوار و زبوں
سبق ملا ہے یہ معراج مصطفے سے مجھے — کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

اقبالؔ

مقیم اثر کی عظمت کا راز یہ ہے کہ اس نے اپنی تخلیقی کاوشوں پر کبھی پابندی نہیں لگائیں۔ اپنی فطری شخصیت کے جوہر کو کسی چاند کا محتاج نہیں بنایا۔ جس کے باعث اس کے فکری سمندر میں مدوجزر پیدا ہو بلکہ وہ دلی جذبات کے ساتھ اپنی جُملہ فطری قوتوں کو مشاہدات، تجربات، احساسات اور مجاہدات کے زندہ آتش فشاں میں جھونک دیتا ہے جسے ہم درزبانِ غالبؔ اس طرح بھی بیان کر سکتے ہیں۔

جوہر تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم
ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اُگاتا ہے مجھے

مقیم اثرؔ اپنے تجربات ومشاہدات کو تقلید سے ہٹ کر شعری پیکر عطا کرتا ہے۔

جدّت وہ دکھائی ہے افکار و تصور نے
ذرّے میں کئی عالم پائے ہیں تغیر نے

مغرور سمندر بھی قطروں سے ملے جھک کر
اعجاز یہ بخشا ہے اندازِ تفکّر نے

احساس کی شدت ہے یا حسن کی خودسوزی
چہرے سے نقاب الٹی اسرار و تحیّر نے

اک آگ سی پھیلی ہے شبنم کی زمینوں میں
ٹھکرایا تواضع کو جیسے ہی تکبّر نے

احساس لطافت کو سینے میں جگہ دے کر
پھولوں کی قباسی ہے پُرنور تدبّر نے

اب اپنے ہی چہرے پہ لپٹی ہوئی پاتا ہے
جو گرد اڑائی تھی اوروں پہ تمسخر نے

ہر رنگ لہو میں ہے، ہے شرط کوئی ڈوبے
خوشبو نئی پھیلائی خوشبو کے تناظر نے

یہ شہر تو خوشبو کا من چاہا بسیرا تھا
منظر ہی بدل ڈالا تصویر تنافر نے

پتھر کو قفس کہنا توہین ہے دریا کی
چٹانوں کو پگھلایا قطروں کے تواتر نے

نظام صدیقی نے ۔۔۔۔ مقیم اثرؔ کو ۔۔۔۔ مابعد جدید غزل کا پہلا تخلیقیت افروز سخن ور لکھا ہے ۔۔۔۔ کہیں مقیم اثرؔ کو **پچاس دیوانوں کا ایک "دیوانہ شاعر"** لکھا ہے ۔۔۔۔ کہیں مقیم اثرؔ ''نسل نو'' کے چراغ ہی نہیں بلکہ اس کو خورشید نیم روزی نشان و پہچان بن گیا ہے۔ اس کے وجود کے اندر مشعل دردانفس و آفاق روز بروز روشن تر ہوتی جارہی ہے جو اس کی بودھی بصیرت کا ترجمان ہے۔

وہ اپنے خوں میں سمادھی لگائے بیٹھا ہے — تمام مشک ہوئے بال و پر خبر ہے کسے

مقیم اثر

کہیں یہ لکھا ہے۔۔۔۔مقیم اثر کے شاعرانہ خواب عرفاں (ویژن) میں تین نسلیں سانس لے رہی ہیں۔اس کے پاس ماضی کی کلاسیکیت بھی ہے۔ترقی پسندوں کا فکری اندوختہ بھی۔۔۔۔جدید و مابعد جدید کا روشن استعارہ بھی۔۔۔۔مقیم اثر (۱) خود بینی (۲) کائنات بینی (۳) رستخیز تغیرات بینی کے تین مراحل سے شعوری طور پر گذرنے کے بعد اپنی (۱) اضافی تخلیقیت آفرینی (۲) اضافی معونیت آفرینی (۳) اضافی عصریت آفرینی (۴) اضافی فنیت آفرینی کے وسیلہ سے جب اپنی مابعد جدید نسل تک سفر کرتا ہے تو اکیسویں صدی کے لئے ایک مستقبل افروز اور مستقبل پرور غزلیہ و نظمیہ مخاطبہ بن جاتا ہے۔۔۔۔کہیں یہ لکھا ہے۔۔۔۔ "**لا تقنطوا**" "**نغمہ سنگ**" سے "**بدن نژاد قبا**" ۔۔۔۔تک شعری سفر کیفیت انگیز اور معنی خیز اعلامیہ ہے۔۔۔۔اسلوب آدمی ہے اسلوب بدن نژاد قبا ہے اسلوب نغمۂ سنگ ہے اس بدن نژاد قبا میں "نیو کلیائی مافوق تخلیقی توانائی کا سمندر موجزن ہے:

سینکڑوں عالم ذرا سی جان میں رکھتے ہیں ہم — کیسے کیسے رنگ و بو گلدان میں رکھتے ہیں ہم
صورت لالہ کھلے ہیں اپنے خوں کے دشت میں — آگ بھی لیکن اسی چٹان میں رکھتے ہیں ہم
دیکھنا، پڑھنا، سمجھنا، ذکر کرنا صبح و شام — اس کا جلوہ آنکھ کے جزدان میں رکھتے ہیں ہم
زمیں کا چاند بھی وہ مشک بھی گلاب بھی وہ — جو برف ہو یہ لہو شہر آفتاب بھی وہ
تمام آئینے گونگے ہوئے یہیں آکر — ہے آپ اپنا جواب اور لاجواب بھی وہ
اسی کے عکس سے لفظوں میں جگنوؤں کا رقص — مرا سکوت بھی دریا کا پیچ و تاب بھی وہ
کلیم حرف کی تہہ داریوں سے عاجز ہے — کلام جس پہ ہوا ختم وہ نصاب بھی وہ
"سرابوں" سے بغاوت کر رہا ہوں — میں "دریا" کی عبادت کر رہا ہوں
یہی ہے آسمانوں کی شریعت — میں "مٹی" سے محبت کر رہا ہوں
"تقریر" میں اظہار کا پھیلاؤ کہاں تھا — آباد "خموشی" ہوئی تقریر سے آگے

آخری شعر کے بارے میں نظام صدیقی یوں رقم طراز ہے۔

..... تقریر تو صوتی دورانیہ ھے۔ اُس سے ما قبل اور ما بعد تو بیکراں خاموشی اور غیاب ھی محیط ھوتا ھے۔ بیکراں خاموشی اور غیاب سے ھی حقیقی تخلیقیت اور معنویت وجود پذیر ھوتی ھے۔ مقیم اثر اسی ما بعد جدید تخلیقیت آفریں، معنویت پرور اور مستقبل افروز معاشرے سے تعلق رکھتا ھے۔ جو نئے غزلیہ ادب میں اچانک نہایت خاموشی سے غیاب سے وجود میں آ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ جس طرح شگفتگی غنچہ کی فطرت ہے اور اسے کوئی بدل نہیں سکتا۔۔۔۔اسی طرح شعر کہنا مقیم کی فطرت ہے اس کے بدخواہ لاکھ کوشش کریں وہ اس نعمت سے اسے محروم نہیں کر سکتے وہ خود ہی اپنے کلام کا عارف، نکتہ داں، اور مداح ہے

نکتہ داں خود سازم میرزا یگانہ را　　دل نمی تواں برداشت لذتِ سخن تنہا

(مرزا یگانہ کو اپنا نکتہ داں خود ھی بناتا ھوں (کہ) دل لذّتِ سخن کو تنہا برداشت نہیں کر سکتا)

اس کی شاعری پر مزید کیا تبصرہ..... جرمنی کے مشہور فلسفی کانٹ نے یہ فقرہ کہا تھا

سچ بہت اچھی چیز ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات کا اظہار اور اعلان بھی کیا جائے،،

ویسے بھی ہر کوئی میر و غالب و اقبال کا ہم پایہ نہیں ہو سکتا۔۔بقول شخصے۔۔اور یہ خلاف فطرت ہے۔۔۔

■■■

سہل ممتنع کا شاعر

عزیز ادیبی

شہر کی ادبی فضا میں عزیز ہر ایک کو عزیز رہے ہیں۔ کسی سے ان کی نہ دشمنی نہ دوستی نہ کسی سے کوئی گلہ شکوہ ۔۔۔۔۔ مزاج میں سادگی، بات کھری، چہرہ شاعرانہ اور مسکراتا ہوا قد میانہ اور رکھ رکھاؤ میں سادگی ۔۔۔۔ جیسی ان کی شخصیت ویسی ان کی شاعری۔ یعنی شاعری میں وہی سادگی وہی رچاؤ، وہی نرمی، وہی لچک جو انکی شخصیت کا حصہ ہیں شاعری میں شخص اور شخص میں شاعری۔

عزیز کا نام سنتے ہی ذہن میں خود بخود الفاظ آتے ہیں۔ ان کی انفرادیت اسمیں ہے کہ ان کا انداز بیان اس قدر شائستہ، سادہ، آسان اور دل گداز ہے کہ کہیں کہیں کوئی مصرعہ یا شعر اس قدر رواں دواں اور برجستہ ہوتا ہے کہ سنتے ہی دل و دماغ میں رچ بس جاتا ہے اور ہمارے حافظے میں محفوظ ہو جاتا ہے ان کے بعض اشعار یا مصرعے سہل ممتنع سے بہت قریب ہوتے ہیں اس لئے قارئین کو انکے اشعار، زبانی یاد ہو جاتے ہیں یہی ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

کلام میں انوکھا پن، طرز احساس و اظہار میں جدتیں نہ بھی ہوں تو وہ اپنی بات سادگی سے کہنے کا ہنر جانتے ہیں۔ عزیز زیادہ تر چھوٹی، بحروں میں شعر کہتے ہیں ان کے جذبات عام تجربے کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ وہ ہر ایک کی روداد معلوم ہوتے ہیں۔ وہ روداد کہیں دھیمی، کہیں سیدھی سادی اور کہیں شوخ، لیکن سادگی میں پُرکاری اور شوخی میں متانت کا جوہر پوشیدہ۔

شعراء کو زیادہ تر نقصان طرحی مشاعروں کے مجلسی آداب کے ساتھ ساتھ مشاعرے سے بھی پہنچا ہے۔ جب شاعر، عوام کی سطح سے شعر کہتا ہے تو اس میں عامیانہ پن کا آنا لازمی ہو جاتا ہے پہلے بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے یعنی جگر، مجروح مخدوم، سکندر علی وجد جیسے شعراء نے عوام کو اپنے معیار پر لانے کی کوششیں کی ہیں۔ جس مشاعرے میں، جگر، مجروح مخدوم، سکندر علی وجد شرکت نہیں کرتے تھے تو وہاں

کے عوام کا یہ نعرہ ہوتا تھا مجروح نہیں تو مشاعرہ نہیں، جگر، مخدوم و سکندر علی وجد نہیں تو مشاعرہ نہیں اس لئے مجروح اور سکندر علی وجد جو مشاعروں کی جان ہوا کرتے تھی وہ مشاعروں کے گرتے ہوئے معیار کو دیکھ کر مشاعرے میں شرکت سے گریز کرنے لگے۔ کیونکہ جس انداز میں عوام کا معیار گر چکا تھا۔ اس سے بہتر وہ یہ سمجھتے کہ ہم ایسے مشاعروں میں شریک نہ ہوں۔ اسی طرح ہمارے بہت سے قابل شعرائے کرام مشاعروں کے چکّر میں پڑ کر اپنے معیار و وقار کو کھو بیٹھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سہل ممتنع کی جامع تعریف کیا ہو سکتی ہے۔ غالبؔ نے اپنے ایک خط میں یوں اظہار خیال کیا ہے۔ ''۔۔۔۔ سہل ممتنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں جو دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔'' بقول آل احمد سرور۔

''۔۔۔۔ سادگی قابل قدر ہے مگر سادگی شاعری میں قدر اعلا نہیں ہے۔ اس کا تعلق ترسیل و ابلاغ سے ہے ایک سادگی سامنے کے خیال اور آسان زبان کی ہوتی ہے۔۔۔۔ ایک سادگی جانے پہچانے موضوعات اور جذبات کی ہوتی ہے ایک سادگی۔۔۔۔ براہ راست انداز بیاں کی ہوتی ہے، ایک سادگی۔۔۔۔۔ عام زبان کی ہے۔ شاعری کی بنیاد عام زبان پر ضرور ہوتی ہے مگر اسمیں تشبیہی، توصیفی، استعاراتی، اجنبی الفاظ سے توانائی اور رنگینی پیدا کی جاتی ہے پھر رمز و ایماء کے ذریعے ایک بات سے دوسری بات مراد لی جاتی ہے یا علامت کے ذریعے ایک جہانِ معنی کی تخلیق کی جاتی ہے۔۔۔''

یعنی سہل ممتنع کے اشعار میں نزاکت معنی کے ساتھ ساتھ تازگی فکر کا بھی ہونا ضروری ہے اور نفسِ مضمون کو شاعر نے سلاست کے ساتھ ادا کیا ہے یا نہیں۔۔۔۔ اگر شاعر نے نفس مضمون کو سلاست کے ساتھ ادا کیا تو اس سے شاعر کی حیثیت یا قد و قامت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حسنِ بیان کی اس کیفیت کو شاعر نے اگر عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہے تو اسمیں سلاست، روانی بندش کی چستی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ اسمیں شاعر کی فن کارانہ بصیرت کے ساتھ ساتھ شاعر کا کمال چھپا ہوا ہوتا ہے۔ شعر خود کہہ اٹھتا ہے۔۔۔۔ جس طرح پھول کی خوشبو کو روکا نہیں جا سکتا اسی طرح شاعر کے اچھے اشعار کو روکا نہیں جا سکتا ہے وہ زبان زد خاص و عام ہو ہی جاتے ہیں۔ ویسے بھی ادب یا شاعری کے بارے میں غالبؔ نے اپنے

خط میں کچھ اس قسم کا اظہار خیال کیا ہے۔ ''۔۔۔شاعری قافیہ پیمائی کا نام نہیں، معنی آفرینی کا نام ہے۔''
لیکن یہ قافیہ پیمائی بھی اتنی آسان نہیں ہوتی جتنا کہ فن کار سمجھتا ہے ناصر کاظمی نے بڑا پیارا شعر کہا ہے۔

کہتے ہیں غزل قافیہ پیمائی ہے ناصرؔ
یہ قافیہ پیمائی ذرا کر کے تو دیکھو

اور میرؔ صاحب کہتے ہیں۔

مصرعہ کبھو کبھو کوئی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

ویسے بھی کہا جاتا ہے معنی آفرینی اور نازک خیالی شاعر کے ہر شعر میں تلاش کرنا نادانی ہوگی۔
بقول آل احمد سرورؔ ''۔۔۔۔سہل ممتنع شاعری کی منزل نہیں ہے۔ ایک راستہ ہو سکتا ہے۔'' اس راستے میں عزیز ادیبؔ کہاں تک کامیاب ہیں اس کا فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

ستم کی شکایات کرنے سے پہلے
زباں کٹ گئی بات کرنے سے پہلے

ہم سے پوچھو وہ کیا نہیں کرتے
آپ میں جو رہا نہیں کرتے

وہ دل جو رہے سوز پنہاں سے خالی
چمن جیسے رنگ بہاراں سے خالی

یہ دنیا ہے کیا۔ کیا ہے اس کی حقیقت
یہ ہوتی رہی اچھے انساں سے خالی

وہ موجیں نہیں جو خموشی سے ابھریں
وہ دریا نہیں جو ہیں طوفاں سے خالی

وہ جہاں تک مرے ساتھ چلتے رہے
راستے زندگی کے نکلتے رہے

پھر غم عشق کا آزار ہوا جاتا ہے
کتنا اونچا مرا معیار ہوا جاتا ہے

عزیز ان کی نگاہِ خاص ہو جائے تو کیا غم ہے
یہی گمنام شاعر خلق میں مشہور ہو جائے

کیا ہماری گمرہی کا کوئی لائے گا جواب
سیکڑوں کعبے ہیں دل میں دل صنم خانوں میں ہے

مبارک ہو چمن والو مبارک
گلوں کا ذکر کانٹوں کی زباں سے

رشتہ مضبوط ہو پیمانے سے پیمانے کا
ہم نے دروازہ کھلا رکھا ہے میخانے کا

ہم نے دیکھا ہے کہ جھوٹی بھی گواہی دے کر
لوگ سچائی کو سولی پر چڑھا دیتے ہیں

عزیز ادیبؔی کی پیدائش ۵؍جنوری ۱۹۳۷ء بہادر پور تعلقہ پارولہ، ضلع جلگاؤں میں ہوئی۔ معمولی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش میں مالیگاؤں کا رخ کیا۔ شاعری کا آغاز ۱۹۵۰ء سے ہوا۔ اسکول کے زمانے سے شعر کہنے لگے۔ پہلا قطعہ کچھ اس طرح تھا۔

نہ قفس میں مجھے رکھا نہ ہی آزاد کیا　　میرا اک ذوق بھرا دل اسے نا شاد کیا
علم کا شوق جو تھا دل میں عزیزؔ　　مفلسی نے اسے ہر طرح سے برباد کیا

مالیگاؤں میں قیام کرنے کے بعد عزیزؔ، ادیبؔ مالیگانوی سے منسلک ہوئے یہاں کی ادبی فضا اور ماحول نے ان کی شاعری کو مزید جلا بخشی پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

شاعری دراصل ایک علامتی اظہار ہے اس بات کا کہ اس کا رابطہ عوام سے رہے۔ شاعری صرف جذبات وخواہشات کا اظہار نہیں ہے بلکہ ہمارے اخلاق وکردار میں بالیدگی پیدا کرنے کا نام ہے شاعر انسانوں کو اعتدال کی راہ دکھلاتا ہے۔ فطرت انسانی کے جذبات اور احساسات کے رشتوں کو اپنے تجربات کی روشنی میں تجرد، رہبانیت اور اذیّت سے نجات دلاتا ہے۔ شاعر اور قارئین کے رشتے میں جو چیز مشترک پائی جاتی ہے وہ جذبات واحساسات کی دھڑکن ہے۔ جس پر شاعر کا جادو الفاظ کی شکل میں عوام کے احساسات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ شاعر کی حدیث دلبراں کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ حقیقت کا اظہار ہے جسمیں عوام کی زندگی کے عروج وزوال کی کہانی جسمیں خود شاعر بھی شریک ہے، پوشیدہ ہے۔ اسی طرح انسان فسق وفجور سے بچ جاتا ہے شاعر اپنے فرض منصبی سے غافل نہیں ہو پاتا۔ آتش نمرود کو گلزار بنانے کیلئے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے پختہ ایمان اور یقین کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اس کا اظہار یوں کیا ہے۔

آج بھی ہو جو براہیم سا ایماں پیدا　　آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اور عزیز ادیبؔی مرد مومن کا استقبال کچھ اس طرح کرتے ہیں۔

مرد مومن کا کوئی لائے تو کیا لائے جواب　　مرد مومن آفتاب آمد دلیل آفتاب
یہ مہک اٹھے تو مہکے زندگی کی ہر روش　　مرد مومن گلشن اسلام کا تازہ گلاب
مرد مومن کا اثاثہ کچھ نہیں کچھ ہے تو یہ　　اک طرف شمشیر بُراں اک طرف اُم الکتاب

آج کی سرکار اور تعلیم کے بھگوا کرن کے خطرے میں ہمارا شاعر زندہ ہے یہی بہت ہے نہ تو وہ دہشت گرد ہے نہ بزدل بقول نہرو۔

"۔۔۔۔ آج کا تعلیم یافتہ طبقہ بزدل ہے یا سرکار پرست۔۔۔۔" آج کے زعفرانی لیڈروں سے ہمارا شاعر نہیں ڈرتا اور وہ حقیقت کا اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ بابری مسجد کے ٹوٹ جانے کے المیہ کو شاعر نے کتنی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ سردار جعفریؔ نے اس حقیقت کو یوں پیش کیا ہے۔

کہیں سے سیکھ تو لی ہے ستم گری تم نے بھلا دیئے مگر آداب کافری تم نے
دلوں کو توڑ کے کرتے ہو بت کدہ تعمیر ملا دی خاک میں شانِ صنم گری تم نے

سردار جعفریؔ

سردار جعفریؔ نے تہذیبوں کے تصادم کو تہذیبوں کے تکلم سے اشعار میں ڈھال دیا ہے تہذیبی ٹکراؤ کے پس منظر کی پُر زور الفاظ میں مذمت نہیں کی ہے لیکن کھلی غنڈہ گردی اور جنونی دہشت گردی کا واضح اشارہ ہمیں ملتا ہے۔ کارسیوکوں کی حرکتوں کا ان کی اشتعال انگیزیوں اور منافرت پیدا کرنے والی سرگرمیوں کے پس منظر میں ایک ہلکا سا اشارہ ہے۔ حکومت کی غفلت اور لاپرواہی کے دخل کو بھی بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔ سردار جعفریؔ نے سیکولرازم کے مطلب کو رواداری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ آج ایک "المیہ" یہ ہیکہ دہشت گردی سے ہمارے ملک کو خطرہ ہے جبکہ اعلیٰ اقتدار پر قابض افراد ملک کے سب سے بڑے دہشت گرد ناتھورام گوڈسے کے مؤید ہیں۔ گاندھی کی توہین اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے ہمارا شاعر آزاد ہے۔ اس پر دہشت گردی اور اس طرح کی تعبیر حق بیانی سے روکنے کے لئے اثر انداز نہیں ہوسکتی وہ اپنے موقف کا اظہار برملا کر کے گذر جاتا ہے۔

اس عہد کا المیہ یہ ہے کہ مسیحا اور قاتل کا فرق بھی اٹھ چکا ہے۔ ہمارا شاعر اس فرق کو سمجھتا ہے وہ اس نفس مضمون کو اشعار میں ادا کرتا ہے اور اپنی بے تابی کا اظہار یوں کرتا ہے۔

عرش پرواز ہے یہ خاک تمہیں کیا معلوم کون پہنچا سر افلاک تمہیں کیا معلوم
ایک اک زخم ہے قاتل کی امانت یارو عظمت سینۂ صد چاک تمہیں کیا معلوم

کتنے تاریک گناہوں کو چھپا لیتی ہے　　جگمگاتی ہوئی پوشاک تمہیں کیا معلوم
رازِ دیوانگی شوق بتاؤں کس کو　　تم تو ہو دشمن ادراک تمہیں کیا معلوم
مٹ گئے ان کے عنایات وکرم سے کتنے　　دوست بھی ہوتے ہیں سفاک تمہیں کیا معلوم
وقت نے لوٹ کا فن جن کو سکھایا ہے عزیز　　اب وہی لوگ ہیں چالاک تمہیں کیا معلوم

''اپنی نگری اور اپنے لوگ'' کے اس شہر میں دشمن کو بھی عزیز کہنا پڑتا ہے کم بخت نے نام بھی ایسا ہی رکھا ہے دشمن بھی عزیز کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔

تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ　　واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

عزیزؔ ادیبی نے ہر حال میں صبر وسکون سے کام لیا ہے چاہے مصیبت ہو یا چاہے خوشی دونوں کے درمیان وہ اعتدال پسندی کے ساتھ خوش رہے اسی میں ان کی کامیابی کا راز ہے۔ زندگی کی ۶۵ برس کی بہاریں دیکھنے کے بعد بھی وہ چاق وچوبند اور چُست وتوانا نظر آتے ہیں یہی ان کی صحت کا راز ہے۔

کامیابی چومتی ہے بڑھ کے خود اس کے قدم　　جس کے لب پہ سختی حالات کا شکوہ نہیں

آدمی اگر ہمت، استقلال اور یقین کامل اور سعئ پیہم سے کام لے تو اس کے لئے پہاڑ بھی رائی کے برابر ہے۔ کئی بچوں کے انتقال کے باوجود بھی اس کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔۔۔ کسی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔''۔۔۔ اسمیں شک نہیں کہ تال میل کمزور لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔'' دوسروں کا سہارا وہی لیتے ہیں جن کی اپنی کوئی بنیاد نہیں ہوتی۔ کسی نے سچ کہا ہے''۔۔۔ مجرم ہونے کی وجہ سے جن لوگوں کی تصویریں تھانوں میں لگی ہوئی ہیں آج وہی لوگ اس دیش کے وزارتی کونسل میں شامل ہیں۔'' ہمارا شاعر نہ تو مجرم ہے نہ ہی وزارتی کونسل میں شامل ہے۔ شاعر کا مقام ان سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔ اسی لئے تو برملا اظہار کرتا ہے۔

گل سے گلستاں خالی، جانے کیسا موسم ہے　　نام کی ہے ہریالی ، جانے کیسا موسم ہے
زرد زرد پتوں میں روح تک نہیں باقی　　سوکھی سوکھی ہر ڈالی ، جانے کیسا موسم ہے
آج بھی ترستی ہے اپنے آبگینوں کو　　کھیت کھیت ہریالی ، جانے کیسا موسم ہے

ہر کسی نے دیکھا ہے پھول جیسے چہروں کی ختم ہو گئی لالی ، جانے کیسا موسم ہے
کوئی پوچھنے والا کیوں نظر نہیں آتا دیکھیئے زبوں حالی ، جانے کیسا موسم ہے
فکر بھی نہیں کرتے خود کو ہم بچانے کی ہو رہی ہے پامالی ، جانے کیسا موسم ہے
ہے عزیز ہاتھوں میں نظم گلستاں لیکن مطمئن نہیں مالی ، جانے کیسا موسم ہے

ان اشعار کے مطالعہ سے دلی کیفیت کا اظہار خوبصورت الفاظ کے جامہ میں ہوتا ہے یہ سچ ہے کہ خواب کو حقیقت سے بدلا نہیں جاسکتا لیکن خواب کے ذریعے حقیقت کی عکاسی کی جاسکتی ہے۔ عزیز ادیبی اس سطح پر کامراں ہوکر گذرتے ہیں۔

عزیز نے ہمیشہ آسان سے آسان شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ خیالات میں کوئی پیچیدگی اور الجھاؤ نہیں ہے۔ اپنی بات کو سیدھے سادے انداز میں یا براہ راست انداز میں پیش کرتے ہیں ان کے اشعار کو مکمل طور پر سہل ممتنع نہیں کہہ سکتے لیکن سہل ممتنع کے قریب ہوتے ہیں بعض مرتبہ لفظوں کی تکرار صرف تکرار بن کر رہ جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مطالعہ فن کو جلا بخشتا ہے۔ بقول ابوالخیر کشفی

"۔۔۔ غزل کی تفہیم کے لئے نہایت تربیت یافتہ اور مہذب ذہن درکار ہے اور دوسری طرف غزل اپنی پہلی اور اولین سطح پر پڑھنے والے کیلئے کچھ نہ کچھ معانی و مفہوم رکھتی ہے یہ وہ در ہے جہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا۔۔۔۔"

سہل ممتنع یا سادگی دھوکا دینے والی چیز ہے۔ شاعر اپنے فن میں شعوری و لاشعوری کوشش کرتا ہے بقول ابوالخیر کشفی، "۔۔۔ غزل ساغر و مینا کے اشاروں کے سہارے مشاہدہ حق کی گفتگو کا نام ہے غزل کا کمال یہ ہے کہ اس کے شعر ہماری روزمرّہ کی گفتگو کا جزو بن جاتے ہیں اور یوں ہماری گفتگو کی سطح بلند ہو جاتی ہے۔۔۔" جب شاعر کو اس حقیقت کا عرفان حاصل ہوتا ہے تو وہ سہل ممتنع کے قریب پہنچ جاتا ہے۔۔۔ بقول جمال احسانی۔۔۔" شاعر اتنی ہی شاعری کرسکتا ہے جتنی وہ زبان جانتا ہے۔۔۔"

ابوالخیر کشفی کے مطابق، "۔۔۔ لفظ زندگی کو با معنی بناتا ہے۔۔۔" میں کہتا ہوں کہ لفظ

شعر کو با معنی بناتا ہے جب شعر بامعنی ہو جاتا ہے تو زندگی خود بخود بامعنی ہو جائے گی۔ سیدھے سادے اشعار میں گہرائی وگیرائی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر اپنے فن کے ساتھ انصاف کرے۔۔۔۔ اور فن میں انصاف اس وقت پیدا ہوتا ہے جب شاعر کا شعور ولاشعور نہایت تربیت یافتہ ہو بغیر اس کے شعری توازن قائم نہیں رہ سکتا۔۔۔۔ ابوالخیر کشفی کے مطابق ''۔۔۔ تخلیق ایک بے حد پیچیدہ اور طلسماتی عمل ہے۔ ضروری نہیں کہ فن کار کو تخلیق کے ہنگام اپنے عمل کے تمام محرکات وعوامل کا علم اور شعور ہو، تخلیق میں ہمارا پورا وجود شامل ہوتا ہے۔۔۔۔ شعور اور لاشعور بھی یہی نہیں بلکہ ہمارا معاشرتی اور اجتماعی شعور بھی اس عمل میں شامل ہوتا ہے۔۔۔''

تمام عمر بڑے عجز میں گذاری ہے
ہمارے سامنے کیا حیثیت تمہاری ہے

ان کی رسوائی ہے رُسوائی مری
چھوڑیئے اپنے ہی گھر کی بات ہے

زندگی کا کہیں پتہ نہ ملا
مٹ گیا کوئی زندگی کیلئے

خدا ہی جانے یہ عالم ہے کون سا عالم
قرار ملتے ہی دل بے قرار ہوتا ہے

تمہاری عنایت سے دور ہو کر بھی
غریب اپنی جگہ تاجدار ہوتا ہے

دونوں عالم تھے گوش بر آواز
آپ آمادۂ تکلّم تھے

کہیں بھی ہم نہ گئے زخم دل دکھانے کو
اس احتیاط نے تڑپا دیا زمانے کو

تمہارے لب کا تبسم اگر نہ ہو شامل
ہر ایک پھول ترس جائے مسکرانے کو

مستقل اندھیروں سے ربط خاص رہنے دو
وقت پر اجالے بھی ساتھ چھوڑ دیتے ہیں

زندگی بھر کی پہچان دے دی
راہ چلتے کسی اجنبی نے

ان کے در تک پہنچنا تھا مشکل
پھر بھی پہنچا دیا بے خودی نے

اسی عالم میں مدتوں گم تھے
ہم بھی موجود تھے جہاں تم تھے

اپنی تباہیوں کو بڑے اہتمام سے
منسوب کر رہا ہوں زمانے کے نام سے

حسن کی محفل کو دیتے کیوں نہ میخانے کا نام　　چشم جاناں رکھدیا ہے ہم نے پیمانے کا نام
دم بخود ہیں اپنی اپنی حد میں شیشے کے بدن　　اب کوئی لیتا نہیں پتھر سے ٹکرانے کا نام

ان کے سیدھے سادے اشعار سن کر ہر کوئی چکت رہ جاتا ہے یہی ان کی کامیابی کی دلیل ہے انسانوں کے اندر انسانیت ختم ہوگئی ہے اس کے باوجود ہمارا شاعر انسانیت کے ساتھ زندہ ہے ان کے اشعار کے بارے میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں۔''۔۔۔شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔۔۔'' انتظار حسین نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔''۔۔۔ ہر آدمی اندر ہی اندر دکھی ہوتا ہے جب خواہش مدم تکمیل سے ٹکراتی ہے تو شاعر کہہ اٹھتا ہے۔۔۔''

موسم گل میں دیدۂ تر سے　　پھول بکھریں کبھی گہر برسے
دل تمنا سے ہو گیا خالی　　ساری رونق چلی گئی گھر سے

جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اسی طرح شاعر اپنے اسلوب سے پہچانا جاتا ہے ان کے یہاں جذباتی سادگی ہے جذباتی پیچیدگی نہیں ہے۔ان کا ادراک لطیف ضرور ہے لیکن شعور پختہ نہیں ہے۔ورنہ ان کے اشعار میں ابدیت کے عناصر ضرور راہ پا جاتے شعر میں جذباتی وسعت ہونا چاہیئے۔عزیز کے شعور میں جذبہ وخیال پوری طرح رچ بس نہیں جاتے ورنہ ان کی شاعری میں تہہ داری کے ساتھ ابہام پیدا ہو جاتا۔ان کی شاعری میں جذبہ تو ہے فکر کی گرمی نہیں ہے اس کے باوجود وہ ایک اچھے شاعر ہیں یہی بہت بڑی بات ہے اگر ان کے اشعار میں فکری وحدت ہوتی تو وہ اپنے عہد کے منفرد شاعر ہوتے۔

احتساب اور محاسبہ ذات کا تجربہ اگر خود شاعر کرے تو وہ اپنی مثال آپ ہوسکتا ہے غلطی بڑی ہو یا چھوٹی اس کو غلطی ہی سمجھا جائے گا۔جب یہ تصور شاعر کے دماغ میں باقی رہے گا تو اس وقت وہ اپنی ذات اور اپنے وجود کے ساتھ خود بخود اپنے اشعار پر تنقیدی نگاہ ڈالے گا اور شاعری کے اس فن میں وہ عظیم منصب کا اہل سمجھا جائے گا۔

نپولین نے بالکل سچ کہا ہے۔''۔۔۔انسان کے معتبر سے مضحکہ خیز بننے میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔'' خدا کا شکر ہے عزیز ادیبی آج بھی ہمارے لئے معتبر ہیں۔۔۔مضحکہ خیز بننے میں

ایک قدم کا فاصلہ آج بھی برقرار ہے۔ عزیزؔ ادیبی کی شاعری کو دلچسپی سے پڑھا جا سکتا ہے جس طرح ان کی طبعیت میں، بصیرت میں اعتدال ہے اسی طرح ان کی شاعری میں بھی اعتدال نمایاں ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

احتیاط اس قدر احتیاط — اب تو خوابوں میں آنے لگے
کر رہا ہوں محاسبہ اپنا — کیا لیا اور کیا دیا میں نے
فن سے واقف نہیں اور ہم — نا خدائے سخن ہو گئے
تمہیں کیا سناؤں میں یارانِ محفل — کوئی واقعہ یاد آتا نہیں ہے
دل کے ٹکڑے جدا جدا کر کے — رکھدیا تم نے کیا سے کیا کر کے
بھر دیئے خار اس نے دامن میں — لالہ و گل سے آشنا کر کے
فکر سعی و عمل نہیں جن کو — مطمئن ہو گئے دعا کر کے
زد سے طوفان کی نکل آیا — نا خدا بھی خدا خدا کر کے
فیصلے بھی بدلتے رہتے ہیں — کیا کریں کوئی فیصلہ کر کے
تجھ کو مشہور کر دیا کہ نہیں — جا بجا تیرا تذکرہ کر کے
کر رہے ہو بڑا کمال عزیزؔ — بے وفاؤں سے تم وفا کر کے
آپ تاکید بھی کرتے ہیں کہ بچ بچ کے چلو — آپ ہی راہ میں کانٹے بھی بچھا دیتے ہیں

سردارؔ جعفری کے خیال میں "ماضی کی تردید ممکن نہیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس کی بازیافت کریں۔"

حرف حرفم در مذاق فتنہ جا خواہد گرفت — دستگاہِ ناز شیخ و برہمن خواہد شدن

(میرے شعر کا ایک ایک حرف فتنہ پردازوں کے مزاج میں اپنی جگہ بنالے گا اور شیخ و برہمن دونوں اپنے اپنے طور پر فخر کر سکیں)۔۔۔۔ آیئے ہم بھی شیخ و برہمن بن کر اپنے عزیزؔ پر فخر کریں۔

عزیزؔ اہل سخن بھی کہہ رہے ہیں — یہ اندازِ سخن دیکھا نہیں ہے

■ ■ ■

مراجع

پیغام رضا　امام احمد رضا نمبر ۱۹۹۷ء (بہار)　مدیر رحمت اللہ صدیقی

حدائق بخشش　احمد رضا بریلوی

جان ایمان　عبدالمصطفیٰ صاحب صدیقی　فاروقیہ بکڈپو، نئی دہلی

افکار رضا　۲۰۰۱ء جلد نمبر ۷، شمارہ نمبر ۴، ممبئی ۲۶

ماہنامہ　جہان رضا، لاہور

تاریخ نعت گوئی میں امام احمد رضا کا مقام　صاحب زادہ سید وجاہت رسول قادری، کراچی

محاسن کلام غالبؔ　عبدالرحمٰن بجنوری

انجمن ترقی اردو بند گھر نئی دہلی

باقیؔ ''نئے انوکھے موڑ بدلنے والا میں''، شمس الرحمٰن فاروقی　''جواز'' مالیگاؤں، جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۱۸

باقیؔ ''ایک نامکمل تخلیقی سفر''، فضیل جعفری ''جواز'' مالیگاؤں جلد نمبر ۶ شمارہ نمبر ۱۸

(جون، جولائی، اگست ۸۲ء)

''شاخ اظہار کا نیا پھول'' زیب غوری کی غزل، شمس الرحمٰن فاروقی ''جواز'' جلد نمبر ۱۱ شمارہ نمبر ۲۸

''شائستگی کا وقار'' زیب غوری، فضیل جعفری ''جواز'' جلد نمبر ۱۱ شمارہ نمبر ۲۸

''زردزرخیز'' ''عناصر میں ظہور ترتیب'' سلیم شہزاد ''جواز'' جلد نمبر ۱۱ شمارہ نمبر ۲۸

(نومبر ۸۸ء تا اگست ۸۹ء)

''مستانہ ہیجڑا'' ساقی فاروقی۔ صفحہ ۱۷۱، نومبر ۸۸، اگست ۸۹ ''جواز'' کا شمارہ

''میرؔ میری نظر میں'' آل احمد سرور، میر تقی میر نمبر　آج کل۔ نئی دہلی (مارچ ۱۹۸۴ء)

وجدؔ شاعر اور شخص مرتب یوسف ناظم

ماہنامہ کتاب نما جامعہ نگر نئی دہلی

میں اور میرا فن سکندر علی وجدؔ

اوراق مصوّر ڈاکٹر ظ۔ انصاری

سکندر علی وجدؔ کی تین نظمیں فضیل جعفری

اورنگ آباد ٹائمز ڈیلی

''اداریہ'' ۱۹۸۳ء

ادیبؔ مالیگانوی نمبر:

ہفت روزہ ''بیباک'' مدیر ہارون بی اے جلد نمبر ۱۹ شمارہ نمبر ۲۶، ۲۶ جون ۱۹۸۷ء

ادیب مالیگانوی:

فکر و فن (سرسری جائزہ) ہفت روزہ ''آواز مالیگاؤں'' جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۲۰۶، ۱۴ جولائی ۸۹

مقدّمہ کلام آتش خلیل الرحمن اعظمی ایجوکیشنل بک ڈپو

''پہچان اور پرکھ''

غالبؔ کا نظریۂ شاعری آل احمد سرور

جدیدیت اور ادب مرتب پروفیسر آل احمد سرور، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

جدید تر غزل خلیل الرحمن اعظمی اگست ۱۹۶۹ء

جوش کی شاعری میں لفظ و معنی کا تناسب

(ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی) جلد نمبر ۳۰ شمارہ نمبر ۸، اگست ۱۹۹۰ء

اردو کی چند مشہور کتابیں نمبر ۲ (موازنہ انیس و دبیرؔ مسیح الزماں)

مرتب ساحل احمد اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد

فانی بدایونی مرتب ساحل احمد اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد

فانی بدایونی (مجنوں گورکھپوری) مرتب ساحل احمد اردو رائٹرس گلڈ الہ آباد

جدید فکر و فن ہماچل پردیش، جلد نمبر ۴ شمارہ نمبر ۱۳

''نغمۂ سنگ'' مقیم اثر بیاولی

''لاتقنطو'' سے ''نغمۂ سنگ'' تک ڈاکٹر کرامت علی کرامت مارچ ۱۹۸۸ء

مقیم اثر کی غزلیہ تخلیقیت کے مختلف زاویے نظام صدیقی مارچ ۱۹۸۸ء

غزل میں نعت کی جلوہ گری ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی

''نعت رنگ'' شمارہ نمبر ۹ مارچ ۲۰۰۰ء مرتب سید صبیح الدین رحمانی

روزنامہ انقلاب (۱۹۸۴ء، ۲۰۰۳ء) (ادب و ثقافت) یکم مارچ ۱۹۹۱ء

روزنامہ اردو ٹائمز (۲۰۰۳ء)

مابعد جدید غزل کا پہلا تخلیقیت افروز سخنور۔۔۔۔۔ مقیم اثر

(نیو کلیائی فوق عملی تنقید) نظام صدیقی

APNI MITTI SONA HAI

Arshad Nazar

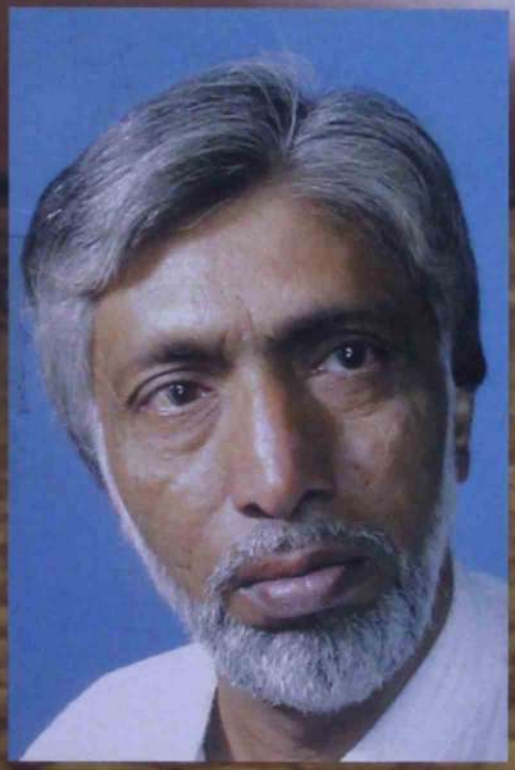

نام : عبدالحکیم عبدالرؤف

تخلص : ارشد نظر

پیدائش : ۱۵/جون ۱۹۵۲ء

تعلیم : بی۔اے (انگریزی) ایم۔اے (اُردو)

شعری مجموعہ : ''برگ درخشاں'' اگست ۱۹۸۴ء مہاراشٹر اُردو اکادیمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی۔

''چاند کرتا ہے گفتگو ہم سے'' ۲۰۰۱ء اُردو اکادیمی مہاراشٹر نے ۵/ہزار روپے کا انعام دیا اور اُردو اکادیمی اُتر پردیش لکھنو نے ۱۵۰۰/روپے کا انعام دیا۔

ادبی کام : ''گفتگو آج سر کوئے بتاں ٹھہری ہے''

زیر ترتیب تنقیدی مضامین کا مجموعہ

''فصل گل قیامت ہے'' شعری مجموعہ زیر ترتیب

AQSA OFFSET PRINTERS, MALEGAON PH:230945